ادھ کھایا امرود
کھٹ مٹھے، درد بھرے نشاطیہ
پرانے اور نئے
افسانے
خان فضل الرحمن

03

خان فضل الرحمٰن

میری لائبریری

ادھ کھایا امرود

کھٹ مٹھے، درد بھرے، نشاطیہ
پرانے اور نئے
(افسانے)

میری لائبریری میں 2.50

مجلد سفید کاغذ : 6.00

خان فضل الرحمان کو دیہات کی اتنی مکمل معلومات ہیں کہ حجر و شجر ، چرند ، پرند ، ندی، نالے، فصلیں، موسم ، تہوار اور رسمیں بڑی پرکاری سے بیان کرتے ہیں وہ گاؤں کے لاوے ، چوکیدار ، نمبردار اور کاشتکار سے ایسے واقف ہیں جیسے انہوں نے اپنی عمر انہیں میں گزاری ہو۔

برکھارت ، آموں کی ریل پیل ، ہریل اور ہریووں کی ڈاریں ، کریل پر لگے ہوئے گل ہائے رخسار ایسے پھل اگر دیکھنے ہوں تو آن کی تحریر میں دیکھئے ، اسی طرح شہری اور تاریخی افسانوں میں بھی آن کا قلم ایسے مناظر دکھاتا ہے جو اس سے پہلے آرزو ادب تو کیا شاید ہی کسی دوسرے ادب میں دستیاب ہو سکتے ہوں۔

ادھ کھایا امرود
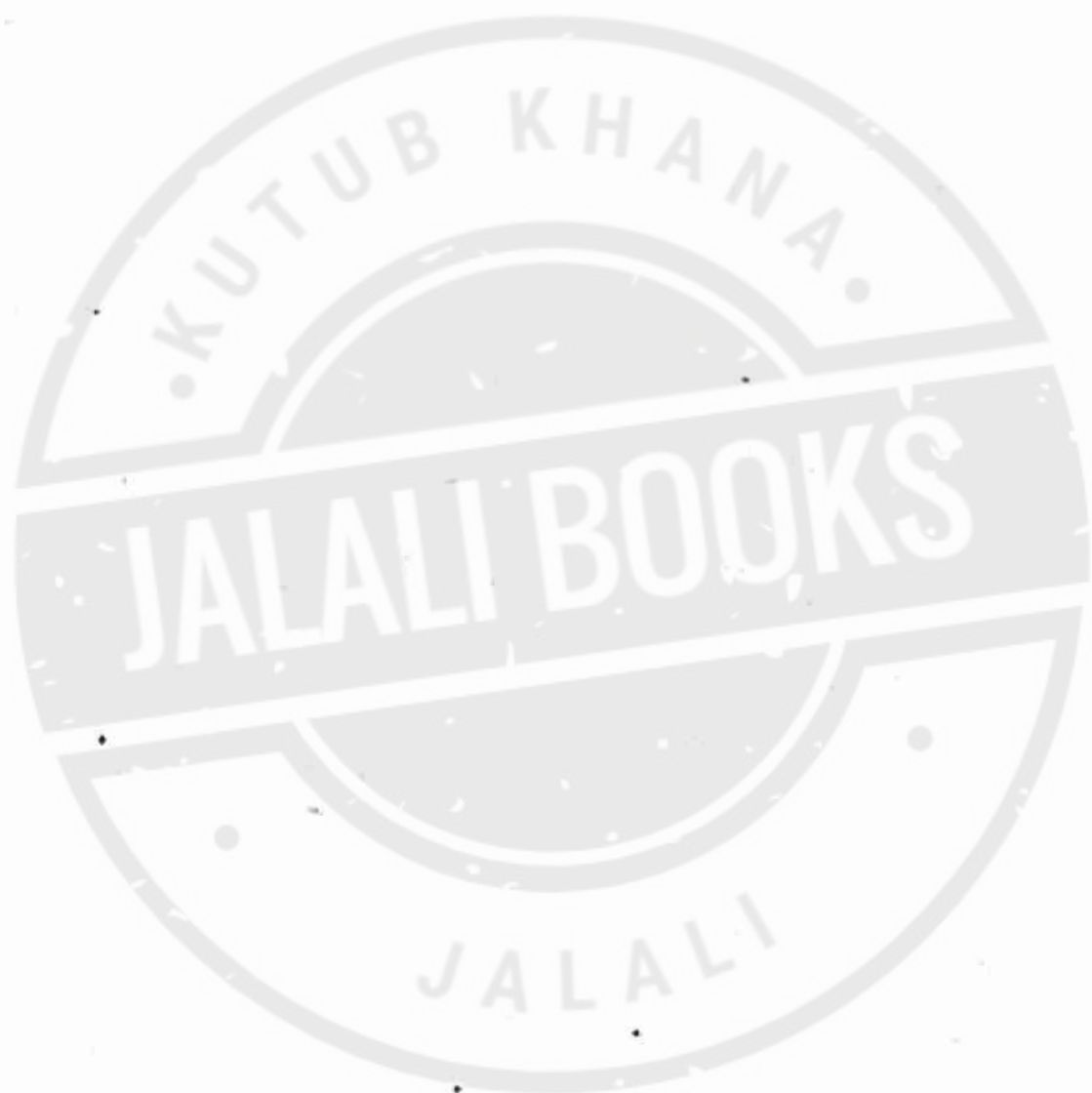
نیرنگی ناٹک سیریز
(۱۰۳)

میری لائبریری میں ناول، افسانہ، ڈرامہ اور رپورتاژ کی دوسری کتابیں

زادِ راہ، منشی پریم چند، مقدمہ خواجہ محمد زکریا

میرزا ادیب کے بہترین افسانے، مرتب عرش صدیقی۔

ندیم کے بہترین افسانے، مرتب مظفر علی سید

خوشبو کے گھاؤ، نوید انجم

فاصلے، سیدہ عفرا بخاری

زندگی کے موڑ پر، چالیس آپ بیتیاں

چاند روشن نہیں، عبدالحمید نظامی۔

۱۹۶۲ کے منتخب افسانے، مرتب ڈاکٹر اعجاز نقوی

منزل منزل ملی بھٹکے گا۔ عنایت اللہ

افق سے افق تک، آغا اشرف

حماقتیں، شفیق الرحمن

مزید حماقتیں، شفیق الرحمن

لہریں، شفیق الرحمن

پرواز، شفیق الرحمن

ہیرے کا جگر، عنایت اللہ۔

خدا دیکھ رہا ہے، عنایت اللہ۔

بہترین پنجابی ڈرامے، عبدالغفور قریشی

کرن کرن اندھیرا، آغا اشرف

میدانِ عمل، پریم چند، مقدمہ خواجہ محمد زکریا

حریفِ مدام، نصیر احمد ناصر

ڈوب ڈوب کر ابھری، ناول/رپورتاژ، سلمیٰ اعوان

رئیس صاحب، شوکت تھانوی

دغاباز، کمال احمد رضوی

لنگے کی ڈائری، کمال احمد رضوی۔

فسانۂ مبتلا، مولوی نذیر احمد دہلوی۔

میرے بھی صنم خانے، قرۃ العین حیدر

تگی دھرتی، مس آئی لن چانگ

سلطانی محلوں کے راز، عبدالرزاق ملیح آبادی

روپ متی، سید فیاض حسین

پتھر کا دیس، عادل رشید

سہرے کے پھول، عادل رشید

آہٹیں، عادل رشید

بڑی رات، عادل رشید

جال ٹوٹتا نہیں، جعفر علی سید

گوپیٹرو، آرنلڈ دیگل

شیر شیر شیر، شکار کی کہانیاں۔

سنگ دشت، کنہیا لال کپور

شیشہ و تیشہ، کنہیا لال کپور

چنگ و رباب، کنہیا لال کپور

۱۹۶۲ کے منتخب افسانے، مرتبہ ڈاکٹر اعجاز نقوی

ادھ کھایا امرود

(افسانے)

خان فضل الرحمان

مکتبہ میری لائبریری لاہور

شوروم: چوک مینار انارکلی لاہور	دفتر: چوک اردو بازار لاہور

میری لائبریری میں پہلی بار ۔ ۱۹۶۵

ناشر :۔ بشیر احمد چودھری، ڈائریکٹر
مکتبہ میری لائبریری لاہور

طابع :۔ نقوش پریس لاہور

کاتب :۔ محمد مسلم گیلانی چاندی کوٹ ضلع شیخوپورہ

قیمت مجلد ایڈیشن چھ روپے

ترتیب

انتساب ۶
تعارف :- از ڈاکٹر وحید قریشی ۹
ناگری ۱۹
الائچی دانہ ۶۳
ادھ کھایا امرود ۹۰
ننگ پیری ۱۰۹
ترلوکی ۱۳۷
دھومن ۱۷۲
باجے والا ۲۰۵
فتنہ بغداد ۲۳۰

انتساب

بنام اُردو... اُردو جو میرے لیے زبان ہی نہیں بلکہ رنگ رانی، امرت بانی ہے۔ بنی سے زیادہ بنی ٹھنی، پربل ہونے کے ساتھ ابلا پری۔ دھیمی مگر شوخ و شنگ، پربین، اور انٹی باز، سیلونت، لائق سند، کھلنڈری، ہتھ فقل مینا۔ ہندی پنجابی کی سنگو وڑی۔ سہیری سی۔ رنگ، رس بھری۔

بنام اُردو... جگ موہنی! جسے میری نگاہِ شوق نے قدیم یونان و روما اور اہلِ ہنود کی دیویوں ایسا سنوار کھا ہے۔ بلکہ ان دیویوں سے بھی کہیں زیادہ۔ جو اسلام مورتی پوجا کی اجازت دیتا، تو میں اس کی مورتی بنوا کر صبح شام تو گھنٹہ بجوا کر پوجا کرتا، لیکن دیدار بازی کا ہر وقت ہی ہوتی رہتی۔

بنام اُردو... چھریرے سے سڈول بدن والی حور جسے قدرت نے شبابِ دوام سے نوازا ہے۔ جس کا تیرہ برس کا سن لاکھوں برس رہے گا۔ اُردو، اُردو، اُردو۔ دیپ دشت اُردو۔ شہر خوباں کی محبوبہ، مہمان نواز، ملنسار، دوست دار بے تعصب وشترمک سمن بر۔ بھاونی۔

بنام اُردو... جو لشکر گاہوں میں پیدا ہو کر دکن اور دہلی کے شاہی شبستانوں میں ناز و نعم سے پلی۔ جو بول اوائل عمری میں اس کے منھ سے کلیوں ہاتے ہونٹوں سے نکلے تھے۔ ان کی شیرینی اور رچاشنی اب تک ادب کا سرمایۂ جان ہے۔ دکن میں یہ چنچل باز محبوب کو سرکا جن، غارت گری کو بیٹ ماری، اور خنجر کو جمدھر کہتی

تھی۔ اور ادھر شمالی ہند میں یہ منتار سی کبھی کبھی گونجھ کہتی ۔۔ ایک اور بھی عجیب لفظ اس
کی زبان پر ہوتا "خلک" مثلاً۔ "ٹلک سیر۔ دیکھو لیا دل شاد کیا اور چل نکلے"۔ جوں جوں یہ
بڑھتی گئی، اس کا لبھاؤ چوکھونٹ مشہور ہوتا گیا۔

اردو۔۔ میں نے اس کے بدن پر ٹکڑوں میں سلی ہوئی شنگلی پوشاک بھی دیکھی ہے
اور میں نے اسے رادھا نگری ساڑی میں ملبوس بجلی کی الجاتی، اپنے چھم چھم چھم کرتے
ہوئے جھانجھیوں بھرے پاؤں سے قیامتیں جگاتی، کاشی ہردوار میں اشنان کرنے
جاتی ہوئی بھی دیکھی ہے اس کے مُدامی بے شکن ماتھے پر کیسر کا قشقہ ہوتا تھا۔

اردو...... زبانوں کے باغ کا سب سے خوبصورت، سایہ دار، اور ثمرآور درخت
ہے جسے چٹ بے کھٹ چڑ، کھر تو اگر دان کر کر بیڑ سے اکھاڑنے پر تلے ہوئے ہیں
ان کا ارادہ تو اب سے جو رنگ کاٹ ڈالنے کا ہے۔ خدا نہ کرے جو یہ جو پھلا پھولا، اچھیلی
جواں برگ مرجائے تو میں ہل رہوں۔ یہ تو میرے من مندر کی دیوی ہے۔ میری اس
کی سنگت کبھی ختم نہ ہوگی۔

اُردو...... جسے لسانیات کے ایوان میں سر و من بندھوا کر راج سنگھاسن
پر استھاپن کرنے کے لیے لائے تھے۔ جہاں یہ خوب سجتی۔ پر اسے تو وہاں سے
کھیدا جا رہا ہے۔ دشمنوں کی بار اجوری سے اس کی ہنسلی اتر گئی۔ اس کے جیغہ ایسے
رخساروں کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ موڑھ لاسے اُکھاڑ کر پھاٹک سے باہر دھکیل رہے
ہیں۔ ان کا ارادہ اسے فرانسیسی ہیروئن جون آف آرک کی طرح سے زندہ جلانے کا
ہے یا اس کا باؤٹا اڑا دینے کا۔ انھوں نے اس کی لوکی اس زور سے کھینچ کر اتاری کہ
کان چھیگیا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی ۔۔

اردو... جو ہند و مسلمان کے ساتھ مچلتیاں کیے رقص و سرود کی محفلیں لگائے، بنجر پیلے میدانوں، دیہات اور شہروں میں پھرتی رہی ہے۔

یہ انتساب ایک تپسی کی طرف سے، اس لالوں کی لال، روپ ونتی، دل آرام کے نام۔ جسے پڑھنے ودست غبار کی طرح اپنے دامن سے جھٹک رہے ہیں اور یہ پھر بھی انہی کے دامن سے بندھی رہ کر ہر طرح کا کسالا سہنا چاہتی ہے۔ جس کی سبکی مجھے اتنی تو لگتا ہے کہ کسی اور کو تو نہ ہو گی۔ ——————

ڈاکٹر وحید قریشی

تعارف

فضل الرحمن خاں اردو ادب کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ وہ زندگی کی اس منزل میں ہیں جب انسان جذبات کے جوش و خروش میں اور حیات و کائنات کے مسائل میں باہمی ربط دریافت کر لیتا ہے۔ جب زندگی کی ہر حقیقت اپنے انفرادی حسن کی وجہ سے دلکش اور قابل ذکر نہیں رہتی۔ بلکہ ادیب کے شعور کی مدد سے زندگی کی دوسری حقیقتوں کے ساتھ مل کر ایک کل بناتی ہے۔ لیکن ہر لکھنے والا اپنے ماضی سے یکسر کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے گوناگوں نقشے اور انسانی تجربات کے وسیع سلسلے اس کی گرفت میں ایک خاص شعور حیات کی مدد سے آتے ہیں۔ اور لکھنے والے کا مطالعہ اس کی ابتدائی دلچسپیاں اس کی کامیابیاں اور ناکامیاں سبھی اس شعور کی تعمیر میں کام کرتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جذباتی زندگی کے طوفانی دھاروں سے گزرنے کے بعد ذہن کی پختگی زندگی میں ایک ترکیب اور توازن دریافت کر لیتی ہے جو عنفوان شباب میں انسان کو میسر نہیں ہوتا۔ فضل الرحمن خاں اب ادھیڑ عمر کی منزل میں ہیں۔ اس لئے ان کے جذبات اور احساسات جوانوں کا طنطنہ رکھتے ہوئے بھی اعتدال اور توازن سے خالی نہیں ہیں۔ ان کے شعور نے جب زندگی کو دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا اس وقت اردو افسانے میں پریم چند کی شہرت تھی اور ترقی پسند تحریک نے نئی نئی مقبولیت حاصل کرنا شروع کی تھی۔ اور اردو کے افسانوی ادب کا رشتہ ابھی رومانی دور کے لکھنے والوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ اُردو کا افسانوی ادب اس مرحلے پر زبان اور لب و لہجے کے اعتبار سے شاعرانہ زبان

استعاروں اور تشبیہوں کا شائق تھا۔ اور دوسری طرف زندگی کے گہرے مشاہدے میں حقیقت پسندی کا سراغ لگا رہا تھا۔ دنیائے افسانہ میں یہ تبدیلی شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر کام کر رہی تھی۔ ہمارے افسانہ نگار اپنے اسلوبِ بیان میں جذباتی تھے۔ لیکن ان کے موضوعات جنوں اور پریوں کی بجائے انسانی زندگی کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ یہ دور پاک و ہند کی تاریخ میں اس طوفانی دور کے فوراً بعد آیا جس کو گدرے تحریکِ خلافت ترکِ موالات اور دوسری کئی تحریکوں نے جنم لیا تھا۔ جذبات کا طوفان اب اس پسپائی سے دوچار تھا جس نے ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا تھا۔ عظیم مقاصد اور بڑے بڑے آدرش دھندلا گئے تھے۔ پھر ساری دنیا اقتصادی بحران میں مبتلا ہوئی۔ چیزوں کی قیمتیں گر گئیں۔ اور اس صورت حال نے حقیقت پسندی کے رجحان کو سہارا دیا۔ اس صورت حال میں ظاہر ہے وہ عظیم مقاصد اور عظیم موضوعات نہیں پھل پھول سکتے تھے جو پہلی جنگِ عظیم سے پہلے یا اس کے فوراً بعد مقبول و محبوب تھے۔ نئے نئے علوم نے نئی بصیرتوں کے نئے راستے تو صاف کر دیا تھا لیکن ابھی مغربی طرزِ فکر کو ہمارے معاشرے میں کوئی مستقل حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت پسندی نوجوان طبقے میں زور پکڑ رہی تھی۔ لیکن ابھی گرد و پیش کے حالات کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کا شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس دور کی حقیقت پسندی محدود موضوعات اور محدود نقطۂ نظر کی حامل ہے اور اسی میں رومانی جراثیم بھی برقرار ہیں۔ اس دور کے افسانہ نگار شہری اور دیہاتی دونوں زندگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے رہے۔ روایت سے ان کی بغاوت انہیں معاشرتی زندگی میں صرف چند موضوع انتخاب کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس زمانے کے افسانوں، ناولوں اور شاعری

میں جنسی موضوع بڑی شدومد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ نفسیات کے مطالعہ نے ہمارے لکھنے والوں کو یہ احساس دلا دیا کہ جنسی جذبہ خیر اور برکت کی چیز ہے۔ قدیم معاشرتی اقدار میں سب سے زیادہ اسی رجحان کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب علم نفسیات کی ترقی نے اسے زندگی کی بنیادی قدروں میں شامل کر دیا تھا۔ ہمارے لکھنے والوں نے اسے ابتدا میں یا تو رومانیت کی فضا اور زنبرستوں میں دریافت کیا یا طوائفوں میں، اس لئے ہمارے افسانوں کا محبوب موضوع اس دور میں یہی چلتے رہ گئے۔ فضل الرحمن کا ابتدائی شعور بھی اسی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ان کا پہلا ناول جو دو برس ہوئے شائع ہوا تھا جنسی جذبے کے اظہار کے لئے اینگلو انڈین معاشرتی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ "آفت کا ٹکڑا" میں فضل الرحمن نے جس طرز زندگی کی عکاسی کی ہے ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ وہ خود اس طرز زندگی سے کوئی براہ راست واقفیت رکھتے ہیں یا نہیں لیکن خود ناول کی حد تک وہ ایک ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو اصلی اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ پھر ناول اور افسانے کی فضا سے باہر حقیقی زندگی سے ان کہانیوں اور قصوں کا رشتہ جوڑنا یوں بھی مہمل ہے۔ جب خود کہانی کے اندر سب کردار اور سب واقعہ اپنا مکمل جواز رکھتا ہو۔ "آفت کا ٹکڑا" دراصل تین جیلی کرداروں کی جنسی زندگی کی روداد ہے، روز منے گارٹ رسنب اور جرسی یہ تینوں کردار انسان کی جنسی زندگی کی تین واضح علامتیں ہیں۔ روزبے انسان کی جنسی زندگی کی غیر ذمہ دار حیثیت کو پیش کرتا ہے۔ اور روز منے گارٹ انسان کی اخلاقی قدروں کی تنظیم کا اظہار ہے۔ جرسی خیر و شر کی قوتوں کے درمیان انسانی خامیوں اور خوبیوں کا مرقع ہے۔ جنس یہاں کسی اخلاقی تعبیر و تشریح کی محتاج نہیں۔ فضل الرحمن لکھے

جسمانی عمل کو اہم جانتے ہیں اور اسی کا اظہار انہوں نے اپنے ناول میں کیا ہے۔

اس ناول کا طویل ذکر زیرِ نظر افسانوں کی اصل حیثیت کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس سے فضل الرحمٰن کے اعتقادات کا پتہ چلتا ہے۔ اور ہم اس کی نشان دہی ہی سے موجودہ افسانوں کی روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ لکھنے والے کی زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر جاننا نہایت ضروری ہے۔ "رات کا کھیلا" اس سلسلے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اس میں جرسی کی جنسی زندگی کو خیر و شر کی دو قوی قوتوں کے درمیان کشمکش میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ آخر میں اگرچہ جرسی کا کردار شر کی قوتوں کو پسپا و کامگار دکھاتا ہے۔ لیکن جرسی کی جنسی زندگی جذبات کی بھٹی سے نکل کر نکھر گئی ہے اور وہ تجربات کی پیچ در پیچ وادیوں سے گزرنے کے بعد اور حیوانی جذبے کی کامیابی سے معصومیت کا ایک اُجلا روپ اختیار کرتی ہے۔ ناول کی یہ مخصوص سمت فضل الرحمٰن کے تصورات کو واضح کرتی ہے۔ وہ جنس کو خیر اور برکت کی چیز سمجھتے ہیں اور جنسی جذبے کے جسمانی اظہار کو ہماری معاشرتی زندگی کی ایک اہم قدر قرار دیتے ہیں۔ وہ جنسی تعلقات اور جنسی زندگی کے دوسرے مراحل کو زندگی کی بنیادی حقیقتوں میں شمار کرتے ہیں۔

اس مجموعے کے تمام افسانے اسی بنیادی قدر سے منسلک ہیں۔ "ناگری" میں ناگری کا کردار تقسیم برصغیر کے واقعات کو پس منظر کے طور پر اختیار کرتا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزشیں پاکستان کا وجود میں آنا، فسادات کا برپا ہونا۔ ان حقائق کو فضل الرحمٰن نے ناگری کے کردار کے پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناگری کو جنسی زندگی اور خلوص جس کے بارے میں مصنف کے عقائد پر روشنی پڑتی ہے

بیمانہ نفرت و حقارت کی فضا میں ناگری کا کردار جنسی ضرورت کے ساتھ ساتھ اخلاقی تسلسل کی ایک ازلی استواری کی نشان دہی کرتا ہے۔ فضل الرحمٰن جنسی ضرورت اور بدی کو عام اخلاقی تسلسل کی مدد سے نہیں جانچتے۔ اس لئے ناگری کے کردار سے اس کی اخلاقی گراوٹ کے باوجود ہمیں نفرت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ جنسی ہیجانات کے الاؤ میں سے ایک عظیم شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے۔ "الاؤمچی والا" بھی شہری زندگی کی فضا میں جنسی ہیجانات کو ایک نئے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کی کردار عورتیں جنسی جذبے کے بارے میں بھی کوئی اخلاقی دباؤ نہیں رکھتیں۔ وہ ایک روحانی جھنے بانے میں جنسی جذبے کی ایک نئی تعبیر دریافت کرتی ہیں۔ جس میں سکون اور راحت بنیادی ضرورت ہے۔ اور انسان کے ظاہری اختلافات اور رشک و حسد کے جذبے سطحی اور فرسودہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ "ادھ کھایا امرود" بھی شہر کی فضا کا سہارا لیتا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے عام افسانوں سے مختلف ہے۔ اس کی فضا میں وہی اجنبی باغوں کی مہک تو ضرور ہے جو ہمیں کرشن چندر اور راے جمید کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن اس کے کردار کسی نیم روحانی فضا کے انسان معلوم نہیں ہوتے۔ وہ ہماری اس معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تعلیمی واقعہ منو کی زندگی کے رخ کو موڑ دیتا ہے۔ اطلس کی شادی افسانے کے ہیرو سے ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں جنسی زندگی کا ایک تیسرا روپ ہے۔ جہاں وہ کوئی شہوانی روپ نہیں دھارتا، بلکہ محض محبت کے جذبے کی تہہ میں ایک مقدس آگ کی طرح روشن رہتا ہے۔

یہ افسانے جنس کے مختلف روپ بیان کرتے ہیں۔ اور ان میں کہیں کہیں لکھنے والا ان منازل کے قریب پہنچ جاتا ہے جن پر فحش گوئی کا شبہہ بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں لکھنے والے کی نظر جنسی اعمال و افعال پر
نہیں جنسی رجحانات کی تعبیر پر زیادہ ہے۔ یہاں افعال چٹخارہ لینے کے لئے بیان
نہیں کئے گئے۔ نہ صرف اصل جذبے کی شکل و صورت متعین کرنے کے لئے
بیان ہوتے ہیں۔ اور ان کا رشتہ کہانی کے تار و پود سے اس طرح مربوط ہے کہ
قاری کہیں بھی کہانی کی فضا سے الگ ہو کر لطف اندوز ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔
جنسی جذبے کا خارجی اظہار اس وقت خطرناک ہوتا ہے جب اسے مقصد کے طور
پر اور مجرد شکل پر پیش کیا جائے۔ فضل الرحمٰن جنسی افعال کی کڑیاں معاشرتی زندگی
کے ساتھ اس طرح پیوست کرتے ہیں کہ ان واقعات و اعمال کی اپنی کوئی خارجی حیثیت
نہیں رہتی۔ وہ جنس کو زندگی کے عام معاشرتی مسائل کی طرح لیتے ہیں۔ ان کے ہاں
جنس محض ایک ہیجانی جذبہ نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی میں افراد اور معاشرتی اقدار
کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت بدلتی چلی جاتی ہے۔ وہ بکہ بند اخلاق کے علمبرداروں
کی طرح ہمیشہ خیر کی کامیابی اور شر کی ناکامی نہیں دکھاتے۔ کیونکہ انہیں عام زندگی میں
ایسے واقعات سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ جہاں بدی کامیاب ہوتی ہے اور نیکی ناکام
رہتی ہے۔ چنانچہ "الائچی دانہ" میں جنس بدی سے وابستہ ہے۔ اور "کھایا امرود" میں جنسی
جذبہ نیکی کا تار و پود بن گیا ہے۔ "نگری" میں جنسی محرکات کی کوکھ سے اخلاقی قدریں جنم لیتی
نظر آتی ہیں۔ جنس کے یہ تین روپ شہری زندگی کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ دیہاتی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ "ننگ پیری" "باجے والا"
"ترلوکی" "دھوبن" دیہاتی زندگی میں جنس کے چار مختلف روپ ہیں۔ دیہاتی اور شہری
افسانوں میں ایک بین فرق زندگی کے مسائل کے علاوہ یہ نظر آتا ہے کہ یہاں جنسی جذبہ

معاشرتی زندگی کے تکلفات و تصنعات سے بڑی حد تک خالی ہے۔ یہ دیہات تقسیم سے پہلے کے وہ دیہات ہیں جن میں غیر متمدن قبائل اپنی محدود زندگی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی ضروریات بھی محدود ہیں ان کے مسائل بھی سادہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور زندگی کے سادہ روپ میں جنسی ضروریات اور جنسی تقاضے کبھی تو دھوپ کا روپ دھار کر واضح ہو جاتے ہیں اور کبھی "بنس باجے والا" کے مرکزی کردار کیطرح دبے دبے گھٹے گھٹے پیار کا روپ دھارتی ہے۔ ان افسانوں میں جنسی جذبے کی مختلف صورتیں کار فرما ہیں۔ "ننگ پیری" "ترلوکی" "باجے والا" اور "دھوپ" کے کردار عام دیہاتی زندگی سے مستعار ہیں۔ ان کی تمام زندگی کی ضرورتیں اور مسائل بھی ہمارے عام دیہات کے مسائل ہیں لیکن ان افسانوں کی ظاہر فضا ایک ہوتے ہوئے بھی کرداروں کی داخلی زندگیاں مختلف ہیں۔ ان افسانوں کے بعض کرداروں کے جنسی افعال درندگی اور بہیمیت کے رجحانات ضرور رکھتے ہیں۔ اور یہ شاید لکھنے والے کی اپنی جنسی زندگی کے غیر مطمئن ہونے کا اشارہ ہے۔ لیکن فنی پختگی کی وجہ سے فضل الرحمٰن اپنی اس خامی کو چھپا جاتے ہیں اور ہر جگہ ایسے کرداروں کو بنیادی اہمیت نہیں دیتے۔ اصولاً ..... وہ بداعمالی اور انسانی سیرت کی نیکی کو متضاد نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان کے برے کردار بھی معاشرتی زندگی میں کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ بدی کے روپ میں چھپی ہوئی نیکیوں کی تلاش و جستجو فضل الرحمٰن کے افسانوں کی خاص خوبی ہے۔ وہ انسانوں کو انسانوں کے روپ میں دیکھتے ہیں، فرشتوں کے روپ میں نہیں دیکھتے عام زندگی کے چلتے پھرتے کردار ان کا موضوع ہیں اور ان کے ذہنوں میں چھپے ہوئے جذبات و احساسات فضل الرحمٰن کی گرفت میں آکر زندگی کی قدروں میں

ایک نیا توازن اور ایک نئی ترتیب دریافت کرتے ہیں۔ وہ ذہنی زندگی کی ترجمانی میں آس پاس کے ماحول کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ انہیں شہری اور دیہاتی زندگی دونوں پر گرفت حاصل ہے۔ شہری زندگی میں انسان کی ذہنی حالت جن خارجی معاشرتی اور مجلسی پابندیوں سے دست و گریبان ہوتی ہے۔ فضل الرحمٰن کو اس کا پورا احساس ہے۔ اور دیہاتی زندگی میں انسان کی خواہشات اور آرزوئیں جس طرح اظہار کے کھلے مواقع ڈھونڈتی ہیں، ان کا بھی انہیں پورا پورا احساس ہے۔ دیہاتی زندگی میں وہ عام طور پر وحشی اور نیم وحشی قبائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ دیہاتی فضا کو پریم چند کی طرح محض نیکی کی فضا نہیں سمجھتے جس میں ہر کردار اخلاقی اور سماجی تقدس کی مثالی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ان کے کردار صنفِ جنسی زندگی کی حد تک مثالی ہیں۔ عام معاشرتی زندگی میں یہ لوگ انسان ہیں فرشتے نہیں۔ ان سے بدیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور نیکیاں بھی۔ ان کی زندگی میں نیک کام بھی ہیں اور جرائم بھی۔ البتہ ان کے اظہار کی نوعیت معاشرتی فضا کی وجہ سے بدل جاتی ہے۔ فضل الرحمٰن کا فن معاشرتی زندگی کی جھلکیاں دکھانے میں بھی بند نہیں ہے۔ وہ سماجی شعور بھی رکھتے ہیں اور زندگی کے واقعات کو ایک دوسرے کے پس منظر میں رکھ کر اس سے نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی دیہاتی فضا محدود ہوتے ہوئے بھی ہند و پاکستان کی عام معاشرتی فضا سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ افسانہ نگار ہیں، معاشرتی زندگی کے مصلح نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اس میں خلوص گہرائی اور حالات کا تجزیہ سبھی کچھ موجود رہتا ہے۔ لیکن بے ضرورت تبلیغ اور نعرے بازی سے کوسوں دور ہیں۔ تمدنی زندگی کے بارے میں وہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ لیکن کہانی کے بہاؤ

کیونکہ کہ پریم چند کیطرح وہ واعظ پر نہیں اتر آتے۔ اس لحاظ سے انکا طریق کار احمد ندیم قاسمی سے زیادہ ملتا ہے اور جنسی زندگی کے بارے میں غیر ضروری تفصیلات اور خطابت ان کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

فضل الرحمٰن کے افسانوں کی زبان کے بارے میں بھی شاید یہ عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ وہ عام بول چال کی دیہاتی زبان سے لے کر ادبی زبان تک استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو شاید یہ زبان کھردری اور ناہموار معلوم ہو۔ لیکن زبان کے استعمال میں وہ اپنے افسانوں کی فضا اور ان کے کرداروں کو ضرور مدنظر . . . . . رکھتے ہیں ان کے دیہاتی اور ہندو معاشرت سے متعلق کردار جو زبان بولتے ہیں وہ عام قاری کے لئے اجنبی ہو سکتی ہے لیکن ان کرداروں کی فطری زبان ہے۔ ادبی اور علمی زبان انہوں نے زیادہ تر شہری افسانوں میں استعمال کی ہے۔ تاہم یہ لسانی تجربہ ہے۔ اور تجربے میں ظاہر ہے کہیں کہیں کھردرا پن اور ناہمواری آ ہی جاتی ہے۔ آئندہ چل کر مشق اور تجربے سے زبان بھی نکھر آئے گی۔ انہوں نے فی الحال ہماری افسانوی زبان میں نئے ذخیرۂ الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ اور اسے نیک فال تصور کرنا چاہیئے۔

ناگری

۱

ڈوئی پہ مچھلی ایسی ململی ململ سی ہندو لڑکی ناگری نے جب سے سنا تھا کہ اس کے عجمی کو کانگرسی گر گئے اور مینڈی کھوپڑی کے جھمبو خاں نے میرا بائی کے چوک میں گالیاں دی ہیں وہ غصے میں اونٹ رہی تھی۔ عجمی نے جھمبو خاں سے یہ کہا تھا کہ وہ جناح کو گالیاں نہ دے اور نیک بخت کھٹ بے نے رحمت اللہ نے عجمی کی تائید میں سورہ الحجرات کی آیت پڑھ کر سنائی تھی۔

اس پر جھمبو اور اس کے شتونگڑے گالی گلوچ سے بڑھ کر عجمی پر تو دست درازی نہ کر سکے مگر کھٹ بے نے رحمت اللہ کو بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ اگر ایک شریف النفس تھانیدار جھمبو کو پکڑ کر نہ لے جاتا تو شاید عجمی کی بھی مرمت ہو جاتی۔ تھانے میں بڑی بڑی ہستیوں کے فون آنے شروع ہو گئے تھے کہ جھمبو کو چھوڑ دیا جائے۔۔ ورنہ قومی کام کو دھچکا پہنچے گا۔ تھانے سے چھوٹتے ہی جھمبو نے عجمی کی حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر جو سرائیکیوں کے مندر کے مقابل رانی بازار میں تھی، بآواز بلند، غرانے کے ساتھ مغلظات سنائی تھیں۔ اور یہ سنہل فقرہ بار بار دہرایا تھا۔ "ابے اب باہر نکل کر دیکھ! مار مار کر دُنبا بنا دوں گا۔"

ان واقعات کی مذمت کرنے والے خود کانگرسی ہندو تک تھے۔ مگر جب سے ناگری نے اپنے چھوٹے بھائی کرپا کی زبانی سنا تھا کہ اس کے چچی کو جھبو نے گالیاں دی ہیں وہ غصے میں بری طرح اونٹ رہی تھی۔ اس نے اس سخت گرما اور لو کی دوپہری میں آرام نہ کیا۔ وہ یہ تہیہ کر چکی تھی کہ جھبو خاں سے ضرور گلار کا بدلہ لینا ہے اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہوگی وہ کھانا نہ کھائے گی۔ چنانچہ اس نے دوپہر اور رات کا کھانا نہ کھایا تھا۔ اسے اپنی ہیچ کی بڑی فکر پڑی ہوئی تھی۔ اسے اتنا غصہ عمر میں کبھی نہ آیا تھا۔ آج جب اس کا باپ ہر دواری چھوٹا بھائی کرپا اور بڑا بھائی ملکند اچھت پر سو گئے تو وہ آدھی رات کو اپنے بستر سے اٹھی۔ وہ ننگے پاؤں تھی کہ چاپ کی آواز سنائی نہ دے۔ مگر جب وہ زینے کی آخری سیڑھی سے انگنائی میں اترنے لگی تو امرود کے نیچے رکھے ہوئے گلار نے دردناک اور زور زور کی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ گلار کے پنجرے کو بلی نے الٹ رکھا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور اگر ناگری اتفاقاً نہ پہنچ جاتی تو طوطے کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ چھت پر جاگر ہو گئی تھی۔ ناگری نے پنجرے کو اوپر لا کر کرپا کے پاس رکھ دیا۔ آج وہ غصے اور فکر کے سبب گلار تک کو اوپر لانا بھول گئی تھی۔

جب سب سو گئے تو وہ دوبارہ اٹھ کر انگنائی میں اتری اور سب دریچے بغلی کوٹھری میں جاکر دیا جلایا۔ پھر اس نے اپنا غرارہ نما زنانہ پاجامہ اور زین سکھ کی کرتی اتار کر مسہری کے تکیے پر ڈال دی۔ اس وقت اس کی خوش قامتی اور سڈول پن البیلا تھا جیسے قدیم یونانی مجسموں کی آن بان۔ اگر کوئی کاشتکار اسے دیکھتا تو وہ اسے ایسی لگتی جیسے منڈی میں گندم کے بڑے بڑے صاف صاف اول نمبر دانوں

کی ہتھیلی پر رکھ کر باہر نکلی دکھائی جا رہی ہو۔ اس نے ٹرنک سے کرپا کا اونچا جوگیا
قمیض نکال کر پہن لیا اور اس کی دھوتی بھی باندھ لی۔ جب اس نے چھوٹی پاٹ
کی کشتی نما ٹوپی اوڑھ کر آئینہ دیکھا تو اس کی ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اس کے پاؤں
میں ربڑ سول کے عنابی جوتے تھے۔

وہ اپنے گھر سے نکل کر گلیوں اور سڑکوں میں کو ہوتی ہوئی شمال مشرق
کی طرف سلوگیوں کے مندر پہنچی جس کے سامنے گجی کی حویلی اور بیوکانیں تھیں۔
اپنے بانکپن میں اور اضافہ کرنے کو اس نے دھوتی کا نچلا پلا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔
یہاں سے وہ صرافہ، پنسار ہٹہ، پھول والوں کے کوچے اور جامع مسجد بازار
سے گذرتی ہوئی گندی گلی میں پہنچی۔ جھمبو یہیں رہتا تھا۔ وہ اس جگہ پہلے کبھی نہ آئی
تھی مگر یہ پتہ تھا کہ اگر تانگوں کے اڈے کی طرف سے گلی میں جائیں تو دو چھوڑ کر
تیسرا مکان کوٹھے کے آگے اسارے والا جھمبو کا تھا۔

وہ اڈے کی طرف سے گلی میں داخل ہو جاتی مگر جب ہی ایک کار سے مدن بیرے سنگھ
ٹھیکیدار جنگلات کا لڑکا، برج موہن، اپنی داشتہ قبولی، جھمبو کی ہمشیرہ کو اتار رہا تھا۔
قبولی گھر میں داخل ہو چکی تو ناگری نے دروازہ کے باہر والی کنڈی آہستہ سے لگا
کر دیوار پر رکھی ہوئی پرانی پرچھتی کو دیا سلائی دکھا دی۔ صبح سے لو کا زور تھا اب
بھی چل رہی تھی، اس لئے آگ آن کی آن میں پرچھتی سے اولتیوں تک پہنچی
اور پھر جلنے لگا۔

جب وہ جھپٹتی ہوئی گلی سے نکل رہی تھی تو شمال کی طرف سے ایک آدمی
آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے اسی طرف جانا تھا مگر وہ جنوب کی طرف ریلوے اسٹیشن

والی سڑک پر پلٹ پڑی۔ آنے والا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب وہ تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ تو گندی گلی سے شور بلند ہو گیا۔ ناگری کے پیچھے آنے والے آدمی نے بھمبو کا چھپر جلتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اور چونکہ اس محلے میں سو فیصدی مسلمان رہتے تھے اس لیے راہ گیر کو یقین ہو گیا تھا کہ آگ اسی ہندو لڑکے نے لگائی ہے جو گلی سے نکل پہلے تو اس کی طرف آیا تھا اور پھر پلٹ کر تیزی کے ساتھ ایسا بھاگا جا رہا تھا کہ یہ آدمی اس کے پاس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب یہ شخص ناگری کو پکڑنے کے لیے اس کی طرف دوڑا۔ ناگری بھی بھاگنے لگی۔ مگر راہ گیر نے کچھ فاصلے پر جا کر اسے آگے سے روک لیا اور چاندنی کی چھا بٹ میں اسے صاف نظر آ گیا کہ وہ لڑکا نہیں لڑکی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کی بانہوں میں پتلی پتلی، نئی نئی، سنگڑیاں بھی تھیں۔ راہ گیر نے اسکا پہنچا اب بھی نہ چھوڑا تو ناگری تنک کر بولی: "ارے کھٹ بنئے! میں تو ناگری ہوں۔ اور میں نے اس بھیسنڈ بنئے کے گھر میں آگ لگائی ہے جس نے مجھے گالیاں دیں تھیں اور مارا پیٹا تھا۔ تو کہاں جا رہا ہے۔؟"

"میں تو لاہور جا رہا ہوں۔ مجھے میرے بہنوئی نے بلایا ہے۔ جس کی تمباکو پان کی اور چارپائیوں کی دوکان ہے۔ پر تو نے بھمبو کے گھر میں آگ کیوں لگائی اور یہ مردانہ کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟"

"اس نے مجھے مارا جو تھا اور گالیاں جو دی تھیں!"

"تو میں نے تجھے اس کا گھر جلانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس نے مجھی صاحب کی بھی تو بے عزتی کی تھی۔ بس میں سمجھ گیا تو نے اس کا گھر کیوں پھونکا

ہے۔ جس طرح تو میرے کبوتر باز بھتیجے ہمداد سے ملتی ہے۔ اسی طرح عجمی صاحب سے ملتی ہو گی۔ مجھے پتہ ہے کہ تجھے ہمداد نے کبوتر دیئے تھے۔ آخر میں تیرا پڑوسی اور محلہ دار ہوں۔ میری گاڑی آنے والی ہو گی۔ مجھے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ تو اپنے گھر جا۔ مجھے کیا پڑی کہ میں تیرا راز کسی کو بتاؤں۔ پر تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ کیا خبر جھبو اور اس کی بہن جل کر ہی مر گئے ہوں۔ آتنی رات گئے جب گھر والے پڑے سو رہے ہوں، آگ نہیں لگایا کرتے۔"

(۲)

اس واقعہ سے اگلی شب ناگری عجمی کو اس کے چوبارے والے باغ میں ملی۔ عجمی کوٹھے پر سگرٹ پی رہا تھا۔ ناگری بولی: "عجمی جی، سگرٹ نہیں پیا کرتے!"

"کیوں ناگری؟"

"اس لیے کہ اس سے آگ لگ جانے کا ڈر ہے۔"

پھر ناگری نے بتایا کہ جھبو کا گھر رات کو اس نے پھونکا تھا۔ اسے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ وہ اسے پونوں میں نہیں بلکہ دن دوپہر میں پھونکتی۔ اور یہ عجمی دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گیا کہ آدھی رات گئے اجلاف اور شہدوں کے اس محلے میں یہ ٹھیلی ایسی انجیلی ہندو کنیا کیسے گئی ہو گی۔ ناگری نے عجمی کو رحمت اللہ کھٹ بنے کا واقعہ بھی سنا دیا تھا۔ اب عجمی کو یہ یقین ہو گیا کہ ناگری کی محبت کوئی کھیل نہیں، اصلیت ہے۔

اس کے ایک ہفتے بعد وہ چوبارے کی اسی سمت میں بستر پہ بیٹھے تھے۔ اونچی اونچی کھڑکیوں میں چھپے ہوئے پپیہے نے بول بول کر جنگل کے پنچھی پھیرو جگا رکھے تھے۔ میٹھی میٹھی بات تھی اور نیلا نیلا آسمان اور اجالا پاکھ۔ کھڑکیوں کے اوپر بلا پتوار کی ناؤ ایسا بادل کا ٹکڑا روئی کے پہل کی طرح اڑ رہا تھا۔ چھوٹی بڑی ڈونگریوں کی طرف سے ٹٹیریوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تب ناگری نے الف لیلے کی کہانی سنائی تھی۔ کہ ہارون الرشید نے کسی کو دسترخوان پہ بلایا، جس نے مچھلی نہ کھائی۔ کارن پوچھا تو کہا کہ وہ جو اس کی ایسی تھی، جیسی کہ میں تمہاری، اسے مچھلی کی باس نہ بھاتی تھی۔ مجھے سگرٹ کی باس نہیں بھاتی۔ یہ سن کر نجمی نے منہ کی سگرٹ چھت سے نیچے پھینک دی تھی اور اس کے بعد اس نے کبھی تمباکو نہیں پیا تھا۔

بھمبو کے گھر میں کیا ہوتا! مگر اس نے غوغا کیا کہ وہ شرنارتھیوں کے نیچے آ گیا۔ کانگرس کو اس کی ضرورت تھی کیونکہ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا اور انتخابات نزدیک تھے۔ اسے کپڑا اور سامان مل گیا۔ اس کا مکان از سر نو تعمیر ہوا۔ چھت پر چوعہ کی کڑیاں پڑیں اور چھپر کی جگہ ٹین نے لے لی جس کے نیچے سمبل کے تختے لگائے گئے کہ تپش نہ آئے۔ جب تک مکان تیار نہ ہوا وہ کانگرس بھون کے کوارٹروں میں رہا۔ بھمبو علی الاعلان کہتا پھرتا کہ اس کے گھر کو نجمی نے پھنکوایا ہے۔ صبح اسے گالیاں ملی تھیں، شام کو آگ لگ گئی۔ مگر اس کا کوئی یقین نہ کرتا تھا۔ ہر کوئی سمجھتا تھا کہ اس نے اپنا گھر خود جلایا تاکہ اسے مال ملے اور وہ شہرت پائے، اگرچہ یہاں بھمبو بچا تھا۔

یہ واقعات پاکستان بننے سے پہلے پیش آچکے تھے۔ جب پاکستان بن گیا تو بھیرو
ترمبک بھوئی فوراً پاکستان سدھارا اور بجمی نے بھارت میں ہی ٹھہرے رہنے کی ٹھان لی۔

پھر بسنت بہار کے دنوں کا ذکر ہے کہ سفری امرود پر پلے کے مارے
ہوئے کھٹی پتوں میں گول گول اور سفید پھل اترتے سورج میں چمک رہے تھے۔
ان پر پارے کی تیز رنگ چنگاریاں عجیب لطف دے رہی تھیں۔ اگر ان امرودوں
پر چاندی سونے کے ورق بھی لگا دیئے جاتے تو یہ سماں پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ جو انگور
کی بیل سہ دری کے سامنے دیوار پر چڑھی ہوئی تھی وہ پت جھڑ سے ایسی ہو رہی
تھی جیسے ارتقائی اٹلس پر دریائے ایمیزن اور اس کے معاون۔ نزدیکی گھری لگیا ندی
کے اور چڑھ محل پر، جس میں جی رہتے تھے، نیل کنٹھ کا جوڑا بولتا، اڑتا اور کھیلتا پھر رہا تھا
اور کبوتروں کی ٹکڑی گھر کا تاوا کیتی اڑ رہی تھی۔ پڑوس کے دھیما مندر میں بسلسلۂ گدی
نشینی مہنت جے جے رگھبیر ہرن خوشی کے سنکھ بج رہے تھے۔

بجمی گھر کا دروازہ کھول کر اندر آیا اور ناگری کے پاس جا کر کہنے لگا: "مجھے چھپاؤ!
مجھے چھپاؤ!" ناگری دالان میں پلنگڑی پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی بسنتی دوپٹے
میں بچکا لگا رہی تھی۔ کل اسے بسنت پنچمی کے میلے میں جانا تھا۔

ایک اجنبی کے اچانک اندر آنے پر امرود پر ٹنگے ہوئے چندر بنی کے طوطے
نے چلا چلا کر گھر سر پر اٹھا لیا۔ سبز پتوں میں لگے ہوئے بڑے بڑے، چکنے چکنے
سفید امرود، جن پر پارے کی گلابی چنگاریاں پڑی ہوئی تھیں، اترتی دھوپ میں
بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

"مجھے چھپاؤ! مجھے چھپاؤ!" کی آواز سن کر پلنگ پر بیٹھی ہوئی ڈھولی اچھلی

جیسی ناگری بولی: "اگر کسی کو چھپائے نہ بنے؟"

"دل کی کنجی! یہ ٹھٹھول کا وقت نہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"پہلے کہیں چھپ کر بیٹھیں۔ میں آج یہاں خوشی خاطر نہیں آیا۔"

ناگری کی بھابی، جس نے نامحرم مرد آنے پر گھونگھٹ نکال لیا تھا، اندر ہی اندر مسکرانے لگی۔

ناگری اسے لے دریچہ بغلی کوٹھری میں لے گئی جہاں صرف ایک پٹاپٹی نواڑ کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کی وہاں گنجائش ہی نہ تھی۔ ناگری نے اسے سرہانے بٹھایا۔ چارپائی تو کھری تھی مگر اس نے مہمان کے دونوں مونڈھے پکڑ کر پیچھے ہوتے بستر سے لگا دی۔ وہ جوتے نکال کر لیٹ گیا۔ ناگری پائنتی سے اوپر ہو کر اس کے نزدیک ہو گئی۔

سرخ چنگیوں والے بڑے بڑے سفید امرودوں کے پیڑ میں لٹکا ہوا طوطا اب بھی شور مچا رہا تھا۔

"تم اسے کسی طرح بند نہیں کر سکتیں؟" اس نے ناگری سے التجا کی۔

"بند تو وہ پہلے ہی ہے۔" اس نے آنکھ کی جھپکی دے کر مذاقیہ انداز میں جواب دیا۔

"تو اچھا، اڑا آؤ۔ مگر جلد۔"

وہ دوڑی ہوئی باہر نکلی اور ایک بڑا سا سفید اور چھیلا امرود توڑ کر پنجرے میں ڈال دیا۔ کچھ امرود توڑ کر کشتی میں رکھے اور اندر سے آئی۔ مگر رام رود

پر ایسے پلا جیسے کوئی حکومت کا بہت بڑا افسر دوسرا افسر سے کوئی بڑا عہدہ دے کر غیر ملک کو بھیج دیا جائے۔

پھر وہ اندر آ کر پوچھنے لگی: "اب بتاؤ۔ کیا معاملہ ہے؟ بیورے وار سناؤ۔"

"ایسے نہیں بتاؤں گا۔ تو مجھ سے بہت دور بیٹھی ہے۔ سنا ہے تو آہستہ آہستہ پاس آ کر سن لے؟ اور دھیرے لگا کر سن۔"

وہ اتنی آہستگی سے اس کی طرف آنی شروع ہوئی کہ نووارد نے اس کی بکڑیوں بھری بانہہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: "ارے رے بجے کی دم بانہ! کیوں زیادہ ترسا رہی ہے۔؟"

"ہم تمہیں ترسا رہے نہیں۔ آہستہ آہستہ پاس آ رہے ہیں۔ یہی حکم سرکار تھا۔"

"کیسی لٹر پٹر اور الٹی پلٹی باتیں بگھارنے لگی!"

موہن دیوالی میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بسیت چڑھ رہا ہے۔ بھاگ نہیں کھیل سکتے۔ وہ بیٹھی ہے۔ آہستہ آہستہ پاس آ کے سن۔ آہستہ آہستہ پاس آ رہی ہوں۔ حکم بجا لانا ہے۔"

"میں تجھے کچھ آہستہ آہستہ سنانا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنی سیاہ گرگابی اتار کر بستر پر اس کے برابر کمر لگا کر بیٹھ گئی۔ اب وہ گویا ہوا: "پہلے ذرا منہ میٹھا کر لوں۔ آ، ذرا پاس کو آ۔"

"آئی میرے گھر میں آیا ہے۔ شیرنی بانٹوں؟"

مجمی نے ناگری کا سر لیٹے ہوئے بستر پر رکھ کر اس کا چہرہ آنکھیں گاڑ کر دیکھا

اور بے حد تندی اور بلا نوشی سے اس کے ہونٹ چوسے اور اتنے چوسے کہ ناگری کے ہونٹوں سے پان کا کھوٹا مجمی کے ہونٹوں پر آ رہا۔

"لاؤ آتنک تمہارا بدن دبا دوں۔ تھکے ہوئے سے لگتے ہو۔"

"تھکا ہوا تو نہیں، گھبرایا ہوا ہوں۔ پیر دبا دے۔ میں تھکا ہوا تو ہوں۔"

"میں نہیں دباتی!"

"دبا بھی دے، زہرن، قہرن۔"

"نہیں! زہری، قہری! نہیں، نہیں! اتیاچاری، نہیں!"

"تجھے ٹکا سا جواب دینا نہ آتا تھا۔"

"سیکھنا پڑا۔"

"کیوں؟"

"جھوٹ کے توڑ کے لئے کبھی کہتے ہو، تھکا ہوا نہیں۔ کبھی کہتے ہو ہوں۔"

ناگری گرمیاں کرتے ہوئے اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ مجمی نے کہا: اب ذرا عقل سے بیٹھوں گا۔ ناگری، کہیں کسی نے مجھے دیکھ نہ لیا ہو۔"

"دیکھ لینے دو۔ اور تمہیں یہاں کون جانتا ہے! بندا قانون گو، رفعت سوڈے والا اور نور دچڑی مار، دود و فغان ہو چکے، پاکستان جا چکے۔ ان کے گھروں میں کوباٹیے شرنارتھی آئے ہیں۔ انہیں دروازوں پر کھڑے رہنے کی عادت نہیں۔ اب اور بتاؤ۔"

"میں گھر جا رہا تھا۔ راستے میں کانگرسی، ورا حراری کا ال اور محمود مل گئے۔

کہنے لگے : عجمی صاحب ، آپ کے گھر مہمان آئے بیٹھے ہیں ۔ فوراً جلد پہنچیے ۔ میں گھر کی طرف لپکا ۔ جال والی مسجد کے نیم تک پہنچا تھا کہ اس تمہارے چھیتن بھائی کرپانے ہاکی لئے ہوئے اسکول کیطرف جاتے ہوئے آواز دی : " بھائی جی گھر نہ جانا ۔ وہ ڈرآئی ہوئی ہے ۔ آپ کی تلاشی لے رہے ہیں ۔ مسلح پولیس کا ٹرک سڑک پر کھڑا ہوا ہے ۔ آپ کو گرفتار کریں گے ۔" مجھے یہ نہ سوجھتا تھا کہ تمہارے بھائی نے مجھے تمہارے گھر آنے سے منع کیا ہے یا اپنے گھر جانے سے ۔ اس کشمکش پر غور میں جا رہا تھا .....

" عجمی جی ، آپ کو ضرور گرفتار کر لینا چاہیے ۔ آپ بھارت کے بیری ہیں اور پاکستان کے رہبر ۔"

" اور ناگری جی آپ ؟ "

" جی ، میں .... میں ۔"

" جی ، ناگری جی ، آپ .... آپ .... آپ نے بندے قانون گو کی بیوی کا برقع دھوکے فریب سے منگوا کر ایک غیر حاضر عورت کا ووٹ مسلم لیگ کے بکس میں ڈالا ۔ اگر میں یہ ہاتھ جب ہی پکڑ لیتا جس میں آپ نے بیچی بے بھیدے کی انگشتری پہن رکھی تھی ؟ "

" عجمی جی ، یہ تو آپ سے ایک کھلی تھی ۔"

" جی ، یہ آپ کی ادا تھی ۔"

" اور جب کٹا کٹی ہو رہی تھی ، تو ان مسلمانوں کو کون بچاتا پھر رہا تھا جنہوں نے کانگرس کو ووٹ دیئے تھے ۔ اور اب کون مسلمان کو پاکستان جانے سے

روکتا پھرتا ہے؟"

"کیوں، اس میں کیا قباحت ہے؟"

"جتنے منہ کم ہوں گے اتنی ہی خوراک بچے گی۔"

"اچھا تو میں چلا جاؤں؟"

"شریماں جی آپ کو کون روکتا ہے۔ میں تو اول دن سے کہہ رہی ہوں۔"

"کیا؟"

"خیر، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ جہاں کا پتھر ہے وہیں لگنا اچھا ہے کیونکہ گستاخی میں شمار ہوگا۔ مگر یہ چتاؤنی دیتی ہوں کہ اولے پڑنے سے پہلے سر کی چنتا لازمی ہے۔"

"کہتی بھی سب کچھ ہو اور گستاخی بھی نہیں کرنا چاہتی۔"

"خیر شریمتی جی آپ کی یہاں چاہنا نہیں۔ آپ کے باغ بغیچوں میں تو جوں سری گوبند سنگھ کے سکھوں نے امروج سے بھوسے ڈالے تھے۔ آج لبنت ہوگئی۔ ابھی تک جھونٹے سے کہ ان کا من بھرا نہیں اور آپ کا وہ پہاڑ کی ٹیکری والا دو کوسا فارم آپ کے بال بچے آپس میں بانٹ چکے۔ آپ کے پاس یہاں دھرا کیا ہے جس کے ساتھ چپک رہے ہو؟"

"میرے پاس سب کچھ ہے۔ بتاؤں؟"

"بتاؤ؟"

"میرے پاس ایک تسلی بھلی ہے۔ آپ زمزم زمزم ایسی کھاری اور کھٹی زبان ایسی کراری کرارتی!"

"اگر وہ آپ تمہارے ساتھ وہاں جانے کو تیار ہو۔ کہہ دو،" اس کیلئے وہاں چارہ نہیں!"

"ہاں چارہ نہیں

"وہاں اس کے لئے چارہ نہیں، جس نے اسے اپنی ماتر بھومی سے بھی دور رکھا۔ اس کے لئے چندے دیئے دل و جان سے ووٹ دیا، پرارتھنا کی۔"

"کیا ہو گی؟"

"تو جس کے چلاسرے میں آ کر یہ کام کئے اسے چاہیے مجھے سنگ لے جانے کے لئے نیوتا دے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا"

"ساتھ نہیں جاتی ...... تھوڑ ٹھیکا کے نیوت لینا!"

"نہیں!"

"اوہ عجمی جی، آپ جو کہا کرتے ہیں کہ میری صورت ایسی خراب ہے کہ اسے ہر ایک بُری ہی نظر ڈالتا ہے تو کیا آپ اس کارن بھی مجھے پاکستان لے جانا نہیں چاہتے ہ؟"

"اب تو تجھے سچ مچ الہام ہو گیا۔"

"شکریہ، عجمی جی، شکریہ! نمسکار کرتی ہوں، نمسکار۔ ننگا کے میلے میں چکی رہا ہے کا کیا کام! تمہاری رواداری تمہیں مبارک۔ نہ لے جایئے، عجمی جی! میں کون سی وہاں جا کر سرن کی ہنسلی، رتنا ولی، ہیروں کے جڑاؤ چمپا کلیاں اور ہزاری دھکدھکی پہن لیتی۔ دھنیہ ہے تمہارے اچپل اور اٹل ارادے پر۔"

نمی جی، دھنیہ! کون کسی کے سنگ جاتا ہے۔ اور مجھے کون تمہارے سنگ جانے دیتا۔ میں تو بس تمہارا دل دیکھ رہی تھی۔ میرا جی ہی رکھنے کے لئے کہہ دیا ہوتا "چلی۔" استر بستر چھوڑ کر کون کہیں جائے گا۔ تم دل کے بڑے کچے اور بودے نکلے۔ تم نے اتنی بے طاقتی دکھائی۔ میں تمہیں اتنا ادھیر نہ سمجھتی تھی۔ تمہارے اس چھوٹے سے دیس میں ایک ڈوبی بھیل کی کھپت کیسے ہو سکتی تھی۔ جسے اپنا ہی آپا سنبھالنا بھاری ہو وہ دوسرے کا بوجھ کیسے سہارے گا۔ اچھا تو خود ہی چلے جائیے۔ ایسا بھی کبھی نہ ہوگا۔"

"نہیں! جب میں اوروں کو وہاں جاکر بار بننے سے روکتا ہوں تو خود وہاں کیسے جاکر پڑ رہوں۔ ہم بھارت کے مسلمانوں نے پاکستان اسلئے نہیں بنایا کہ خود وہاں جاکر پر مہمان ہو جائیں۔ دستر خوان بچھایا گیا۔ مہمانوں کی خاطر؛ کھانا کم ہے: اور میزبان آپ لمبے لمبے ہاتھ مارنے لگا اور مہمان ابھی لقمہ بھی نہ لینے پائے تھے۔ کہ ہاتھ دھلانے کی سلفچیاں آنے لگیں۔ ہماری پریشانی ہرگز نہ تھی۔ کشتی میں جتنے مسافر بیٹھ سکتے تھے، بیٹھ گئے مگر اوروں نے بھی لدنے کی کوشش کی تو کشتی کو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ کشتی پیاری ہے اور اگر بوجھ کی وجہ سے اسے کچھ بھی گزند پہنچنے لگے تو میں وہ پہلا شخص ہونگا جو بیچ سمندر میں کود پڑنے سے ذرا بھی نہ ہچکچائے گا ....

ناگری کیا سو گئیں؟

"سوئی نہیں، آنکھیں بند کئے لیٹی تھی کہ نیتا جی کا دکھیاں غور سے سن سکوں" انسانوں سے کشتی بھلی! اور پاکستان کے دیوتاؤں سے اس کے شتر دھے۔ مجھ

اور بڑھوتا بھلو خاں، جو قائداعظم کے سے نئی نئی گالیاں تراشا کرتا تھا۔ وہ
جھڑوس تو اپنی بہن قبولی کی بھرڑوائی کھاتا کھاتا وہاں پہنچ گر مزے اور سکھ پائے
اور بجبی، جو "زندہ باد۔ زندہ باد" پکار پکار کے اپنا گلا بٹھالیا کرتا تھا بھارت کی
جیلوں میں پڑا سڑے۔ اچھا، بجبی جی، نہ مانو۔ ٹھہر و بگڑے جاؤ اور قید کاٹو۔ آپ
اسی قابل ہیں۔ آپ کے دوست بابو امر سنگھ نے آپ کو بہتیرا افہام کرنا چاہا کہ
بھلے آدمی، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو کانگرس میں شرکت کرے۔ سگر۔"

"ناگری! تجھے معلوم ہے کہ ہم مسلمانوں میں کسی کا مالک وارث مر جایا کرتا ہے
تو ایک مدت معینہ تک سوگ منایا کرتے ہیں۔"

"اور تم نے یہاں کی مسلم لیگ کیوں نہیں توڑی اور جھنڈا دفتر سے کیوں
نہیں اتارا؟"

"میں نے تو لیگ کونسل کے اجلاس میں صرف یہ کہا تھا کہ آپ لیگ کو
توڑنا چاہیں تو توڑ دیں مگر اس کاغذ پر میرے دستخط نہیں ہوں گے اور نہ میں
پھریرے ہی کو نیچے کھینچوں گا۔ دراصل میرے خلاف شہر کانگرس کا مسلمان
صدر اور ضلع کا ایم ایل اے زہر افشانی کرتے رہتے ہیں۔"

"ایم ایل اے! وہ تو تمہاری ماسی کا لڑکا ہے۔ پر تم نے بھی اس
کے خلاف کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اور وہ بنج بھوکن 'ایشور اسے غارت
کردے'، کہتا پھرتا ہے کہ بجبی کو کتے کی طرح گولی مارے گا۔"

بجبی ناگری کے پاس عصر کے وقت آیا تھا اور جب جھٹپٹے کے وقت دھیما
مندر میں سنکھ اور گھنٹے بجے تو گرپا آکر بھاوج سے پوچھ رہا تھا کہ ناگری کہاں

ہے اور وہ گلگلوں کی کڑاہی پر ذرا کو ہاتھ ٹھہراتے ہوئے ایک چارپائی والی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ "وہاں !" اس کے بعد نجمی کا ذکر آ گیا اور بھابی نے اسے منہ سے بتایا کہ وہ بھی ناگری کے پاس ہے:

"وہیں۔"

۴

پولیس کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجرم فراری، جو مسلم لیگ کا سیکرٹری اور اعیانِ شہر میں سے ہے۔ ہر دوار کی کھٹیک جیسے پنچ کے گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور ناگری کو کون نہیں جانتا تھا۔ تقسیم کے بعد لاہوری شرنارتھیوں کے بگڑے ہوئے لونڈوں نے پچیس روپے پر ٹیپالی ہوٹل میں بلایا اور پچاس روپے کی انگریزی شراب پلا کر اس کی وہ خاطر تواضع کی کہ آدھی رات ہوتے ہی اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ان گنوں کی پولیس کو خوب خبر تھی۔

تو پولیس کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلم لیگ کا سیکرٹری اور نیشنل گارڈ کا سربراہ ہر دوار کی کھٹیک کے گھر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کسی کو علم نہ تھا کہ یہ سب بے دفاؤں کی بے وفا، ترکیبوں بھری قتالہ عالم لڑکی ہے۔ جو مردانہ لباس میں رام چندر جی کا بھیس پہن کر جب ہاتھی پر سوار، شہر کے بازاروں میں گھومی تھی تو شہر کے ہندو مسلمان ایسے پری نژاد مالوک کو دیکھنے کے لئے ڈھوک آئے تھے...... اگر یاد تھی تو صرف نجمی سے۔ اس گوبار اور رچو کھاٹکی کی رگ اگر کسی سے دبتی تھی تو وہ نجمی ہی تھا۔

جمی اس کے پاس ہفتہ بھر ٹھہرا رہا۔ اسے روز روز گھی کے گلگلے، میٹھی پوریاں، کدوکش کی ہوئی لوکی، کو تھمیر، پودینے اور ٹماٹر کا رائتا، پیٹھے کا مربہ، چھلکا اترے ہوئے بلداموں پڑی ماش کی دھلی دال، مونگ کا حلوہ، سونٹھ کا پانی، دودھ بڑے چھوارے، سفید زیرہ اور بالائی ملی دہی، شملے کی مرچیں، ادرک، آلو اور ٹماٹر کا سالن، لگدر اور سفید سفید تلوں کے لڈو اور تل خشکری کھلایا جاتا رہا۔ نہانے کے لئے پیتل کے چمکدار تہہ لے گرم پانی سے بھرے ہوئے موجود رہتے۔ کوٹھری میں اگربتیاں اور لوبان جلتا رہتا۔

اور ناگری! دہکتے گوکھرو لگا چمپئی گھگرا، کپاسی ریشمی انگیا اور ہلکے والی بسنتی اوڑھنی پہنے اس کے زانو سے زانو لگائے بیٹھی رہتی۔ کبھی جمی کے ہاتھ میں اس کے مہندی رچے ہاتھ ہوتے تو کبھی جمی کے ہونٹوں پر اس کے پان رچے ہونٹ۔ اس مختصر سے گوشۂ تنہائی پر بہشت کی وسعتیں نثار تھیں۔ پہ سچ ہے: من چنگا تو کٹھوت ہی میں گنگا!

ناگری کے گھر میں بجلی کا چاندنا نہیں تھا۔ اس کے باپ کو یہ خبر تھی کہ جمی ان کے گھر روپوش ہے اور ان کی لڑکی اس کا من بہلا رہی تھی۔ مگر رات کو اس کے مقررہ وقت پر دوکان سے واپسی سے کچھ قبل ناگری کوٹھری سے باہر آکر رسوئی میں کام کاج کرنے لگتی۔ جمی کے پاس کھانا کرپا پہنچاتا تھا لیکن پیتل کے چمکتے ہوئے تھال میں بھوجن ناگری ہی پروستی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی کے ساتھ کوٹھے میں لیٹتی مگر جونہی اس کا باپ خراٹے لینے لگتا وہ آنکھ بچا کر دیوار گیر بجھا کے ایک بستر والی کوٹھری میں پہنچ جاتی۔ سامنے والی کوٹھری میں

ناگری کا بڑا بھائی مکندا اور اس کی بیوی سویا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا
کہ ناگری حسینوں کی جبلی اور عام عادت کے تقاضے پر مہمان کو ترسانے کے لئے
اس کے پاس نہ گئی۔ دراصل ناگری کا یہ چلبلاپن، انکار اور جھنجھٹ مہمان کا منہ سلونا
کرنے کے لئے تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے بے طلب عطیات اور دعا کی
شیریں طبعی سے اکتا جائے۔ چٹ چوروں کے لئے سدا کی شکر فروشی اچھی نہیں۔
انہیں موقع بہ موقع لون ہار، نجریلا، کٹھن کھرے چنے بھی بننا پڑ جاتا ہے۔
وہ اسی طرح جلتی آگ بجھانے کے لئے تیل ڈالا کرتے ہیں۔ ناگری کے اس
ہیکڑے پن میں بھی بڑے ہی مزے تھے اینٹھے ہی! مربہ کھانے کے بعد اگر
اچار مل جائے تو کیا کہنے۔!

کلجمی ایک بڑے زراعتی فارم کا مالک تھا۔ جہاں مختلف اجناس پیدا
ہوتے تھے۔ وہیں اسے مکئی کی روٹی اور چنے کے ساگ کا شوق پیدا ہوا تھا۔
ناگری اسے یہ بھی مہیا کرتی اور ساتھ ہی زرد زرد گاڑھے گھی سے تر ترائی ہوئی
لال مکئی کی میٹھی چوری بھی جس میں کستوری، پستے اور کشمش ملی ہوتی۔ اس کے
لئے بھینس کے بالائی دار دودھ کا دہی کورے کلہڑ میں جمایا جاتا، جس سے سوندھی
سوندھی .... خوشبو آتی۔ یہ دہی وہ گھی چڑھی ہوئی روٹی کے ساتھ کھاتا۔ پاس
ہی تپائی پر رنگین اچاریاں رکھی ہوتیں، جن سے وہ سانگر، لیموں، آم، گاجر،
مولی، ٹماٹر کا اچار، گلگوندے، سیب، آملے کا مربہ اور امرود کی جیلی لے سکتا۔

جب یوں ہی خمر و عیش میں ہفتہ بیت گیا تو ناگری کی بھاوج نے
اسے خبر کی اس کے ساجن کی گرفتاری پر ایک ہزار کا انعام مقرر ہوا ہے اور

بہت لوگ اس کی کھوج کھوج اور ٹنگن میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ سہم سی گئی اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے سنا کہ میاں مٹھو فرما رہے ہیں!۔

"مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ!" اس نے پنجرہ امرود سے اتار کر زمین پہ پٹخ مارا۔ پھر وہ کوٹھے پر چلی گئی۔

گلی کی دوسری جانب امام بخش پہلوان رہتا تھا۔ اس کے سیاہ فام لڑکے امداد کو کبوتر بازی کی علت تھی۔ ادھر ناگری کے پاس بھی بہت کبوتر تھے۔ پہلے پہل تو ان میں پیشہ ورانہ رقابت چلی۔ مگر امداد نے ناگری کو ہر موقع ہرا کر چھوڑا۔ یہی نہیں کہ اس کے کبوتر اڑان میں مات کھاتے رہے بلکہ وہ اس کے بہت سے بھے ہوئے پرندوں کو پکڑنے میں کامیاب رہا۔ انہیں وہ خوب پر تینچ کر کے نہایت خواری میں رکھتا۔ اس سے اس کا مقصد ناگری کو تاؤ دلانا اور جلانا تھا۔ اس دھینگا مشتی کا یہ اثر ہوا کہ ناگری دانے پر لگ گئی سال میں مفاہمت ہو گئی۔ امداد نے اسے شاہجہان پور کے لکوھے، سندیلے کے یاہو اور فرخ آباد کے چلپرے نذر کئے۔ فرخ آباد کے چلپرے دیکھ کر ناگری وارفتہ ہو گئی تھی۔ مگر پہلوان کے لڑکے کے یہ نذرانے بے سبب نہ تھے۔ وہ ان کا بدل کابلی قرض خواہ کی طرح وصول کر لیتا تھا۔

پر جب ہفتہ سارا گذر گیا اور اسے ایک مرتبہ بھی غفانہ ملی تو امداد بھنا سا گیا۔ اسے ٹوہ سی لگ گئی کہ وہ کہاں الوپ ہو گئی ہے۔ سو اب جو وہ بسنت پری بنی، سرتاپا پیلی کپاسی پوشاک میں غرق، پیلی پیلی چوڑیاں پہنے، ہرا ہرا

گیندے کے گجرے گلے میں ڈالے، کانوں میں بجلی کے بالے پہنے مہندی سے ہاتھ پاؤں اور ناخن رچائے، گلوری کھائے، کوٹھے پر جاکر نیلے آسمان تلے کھڑی ہوئی تو امداد صبر و طلب کھو بیٹھا۔

پھر امداد نے سیاہ سے کبوتروں کا جوڑا اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا:

"لے ہے! آج کا بناؤ چناؤ خالی نہیں جانا چاہئے۔"

"کیوں"؟

"چلو رے! آ، یہاں آ۔ ٹک گھڑی بھر کو برساتی میں چل کر بیٹھیں۔"

"کیوں، کوئی ٹپاٹپ بارش تو نہیں ہو رہی؟"

"نہیں، ٹپاٹپ بارش تو نہیں ہو رہی مگر سینے میں چھٹ پٹ ضرور ہو رہی ہے۔"

"ارے امداد سوفتہ نہیں؟"

"تو تو پھر شاخیں نکالنے لگی۔ آنکھ ٹیڑھی کئے کھڑی ہے۔ پڑوسیوں سے دل بدل اچھی ہوتی ہے۔ ناٹکے نہیں کیا کرتے۔ میں تو سمجھا تھا تو اب سیدھی ہو چکی ہے۔"

"ارے بادی، میں کبڑی کب تھی؟"

"تیرے ٹھسے تو آج ایسے تھے کہ جگن ناتھ کی رتھ میں بٹھا کر تیرا جلوس نکال لیتے۔"

"جا رے، جا! خوشامد خور ے۔ میں تیرے بڑھاوے میں نہ آؤں۔"

"خوشامد خور تو میں نہیں۔ پر، بھاؤنی، ایک بات ضرور ہے: تو سراپا

تا ہے، میں ناز برداروں میں ہوں۔ تجھے اماں پر کام کرنے والے بہت ملے ہوں گے۔ میں تو تیرا بارہ ماسیا ہوں۔"

"آگے نہ بڑھ! میری گات کو چھیڑا تو جھنجھنیاں پہنا دوں گی۔ بندھا بندھا پھرے گا۔ کانٹیں، تجھ سے تو مجھے کپڑا چھڑانا بھاری ہو گیا۔ ذرا اس تاڑ کو دیکھو، مجھے کیسی آنکھیں چیر چیر کر دیکھ رہا ہے۔"

"ستیا ناس جائے، تیرا لوٹا ڑ جائے۔ مجھے ناراض نہ کر۔ آنا کانی چھوڑ۔ ری چھلانگ، تاجدار چڑیا! کئی دن سے بڑی بے چینی ہو رہی ہے۔ کام میں جی نہیں لگتا۔ نٹھلا بیٹھا ہوں۔"

"ارے اُلو کی چونچ! ڈیوٹ! اوٹ پٹانگ باتیں کر کے میری بوٹیاں نہ کھا۔ زیادہ لگ رہی ہے تو اپنی لڑکوری پہ جا، گل دو پھیرے!"

"میری گلابی ریوڑی، میری جادو کی پڑیا تو تو ہے۔ اس پہ کیسے جاؤں۔ تیرے ہی لئے تو میں تونسا تونسا رہتا ہوں۔ جھانولی بالڑ تو تو ان بے زبانوں کو دانہ پانی دینا بھی بھول گئی۔"

"اور تو جو تھا؟"

"اگر میں خبر گیری نہ کرتا تو سب تتر بتر ہو گئے ہوتے۔ میں تو نہیں بھی تک کھلاتا رہا، پر تو نے ان کی اڑان ایک دن بھی آ کر نہ دیکھی۔ کیا کسی مہمان کی خاطر داریاں ہو رہی ہیں؟ خدا اس کا بستر گول کرے۔"

"ارے کبوتر باز، یہ بات نہیں۔"

"تو پھر تیرا پے کیوں نہیں ملتا؟"

"بس سہتا نہیں ہوتا۔

"اچھا، مجھے پلک پیٹ کر دکھا۔ پہلے مجھے تیرے اسی سبھاؤ نے مارا تھا۔"
اس نے دو دفعہ پلک پیٹی اور ایک دفعہ سین ماری اور یوں اپنی لیلیٰ دکھا کر زینے کی طرف چل دی اور امداد طوفان شوق میں گھرا ہوا اسے دیکھتا رہ گیا۔
نیچے طوطا اب بھی بول رہا تھا: "مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ۔" اور اس کے اندر سے پنجرے کو نگر گٹنی پھموتجن سیدھا کر رہی تھی۔ ناگری کی ٹک ٹک جھنک دیکھ کر تجن کے منہ سے نکلا: "تو کب سے دلہن بن گئی؟ ہمیں تو پتہ بھی نہیں ہوا۔"
ناگری نے اپنی چپہ تر آنکھوں سے تجن کی طرف دیکھا۔ اس سے پنجرہ چھپٹ کر کھڑکی کھولی اور طوطا اڑا دیا۔ پھموتجن ابھی اس کی طرف تک ہی رہی تھی کہ اس نے لپک کر جا کوٹھری میں دم لیا۔ تجن بھابی سے کہتی رہ گئی: "بڑی ہوائی اور نخرے پیٹی لڑکی ہے۔ وہاں اس کا کون بیٹھا ہے جو یوں تیر کی طرح جا پہنچی۔"
پھموتجن کے چلے جانے کے بعد ناگری نے بھگڑے والے پیر سلیمانی کا دیا ہوا گروناما کوٹھری کے دروازے پر ٹانگ دیا اور بجی کو لئے ہوئے کوٹھے پر چڑھی۔ وہاں اس نے سات پاموز مہمان کے سر پر سے وار کر آخر جنگل کی طرف پھینکے کہ جس طرح یہ واپس آئیں گے اسی طرح سے مسافر بھی آ جائے گا۔
نیچے آ کر بجی تو کوٹھری میں چلا گیا اور ناگری صدقے کے پاموزوں کی متوقع واپسی کے لئے چھتری تکنے لگی۔ اسے یوں گھنٹے بھر سے زیادہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ جھٹپٹے کے وقت دھیما مندر میں سنکھ اور گھنٹے بجنے لگے۔ بکس ان میں سے

ایک بھی کبوتر چھتری پر نہ اترا۔ پھر وہ کوٹھے پر گئی کہ وہ وہاں ضرور اتر گئے ہوں گے۔ لیکن وہاں اور سب تھے، وہی سات نہ تھے۔

یوں ژولیدہ حال وہ اندھیرے میں نیچے اتری اور کوٹھری میں سے مجھی نے دیکھا کہ وہ کوٹھے ٹھنڈے کر تی پھر رہی ہے۔ روہانسے پن سے اس کا حاشیہ دھن کچھ بگڑا ہوا سا تھا اور رنگ فقنہ گری کجلایا ہوا سا۔ شام سے کتے بھونکنے لگے اور اگلے دن گلیا اینٹ کے اجڑ محل سے گرڑ ایسا غائب ہوا جیسے دل میں تا رہے ہوں۔

۵

اس نے طوطا اڑا دیا۔ اسے اس کی گردن مروڑ دینی چاہیے تھی۔ وہ طوطا گلیا اینٹ کے اجڑ محل، اٹاریوں، چھ باروں، دو منزلوں، چو منزلوں، اچھتوں، منڈیروں، گنبدوں، میناروں، دوکانوں، اصطبلوں، کیکروں، بیریوں، اور پرانے آموں پہ بیٹھتا، راز افشا قسم کی آواز "مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ" بلند کرتا پھرتا تھا۔ خلق کے سروں پہ سے جھانجھ دار جھنجھیاں بجاتا اور مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ" چلاتا گزرتا۔ ناگری نے جو سات پاموز مجھی پہ سے وار کے پھینکے تھے، انہیں تو اجڑ محل کے اطیوں سے لٹوروں اور ترچھیوں نے ایک ایک کر کے دبوچا اور کھایا۔ لیکن اس طوطے پر دھاڑ نہ پڑی۔ اس کے چرچے چنڈو خانوں، تاڑی گھروں اور دیسی شراب کی بھٹیوں تک میں ہونے لگے۔ چار کھونٹ اسی کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا چرچا ہر جگہ تھا۔ مگر اس کی

تو کسی نے بھی نہ پائی تھی۔

ایک دن وہ طوطا گلاں باڑے سے اڑ کر پولیس چوکی کے متصل، نیپالی ہوٹل کی بکائین پر آ بیٹھا۔ رنگروٹ تھانیدار جوشی کے پاس پھمّو جمّن آئی ہوئی تھی۔ اسے تھانیدار سے کتنا پا لینا تھا، مگر تھانیدار کی جیب خالی تھی۔

اب جو طوطا "مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ" بول کر کان پھوڑنے لگا تو بہاڑی جوشی نے جمّن کو ٹالنے کے لئے کہا، "جس گھر کا یہ طوطا ہے، اُجمّی وہیں روپوش ہو گا..........."

جمّن ہزار روپے کی لالچ میں کرتن گھوڑے کی طرح بھاگی اور شہر کے دوسرے سرے پر جا، ہر دواری کھٹیک کے گھر سانس لیا۔ اس وقت سکر دوپہری تھی۔ بھابی چولہا چھوڑ کر کوٹھری میں سو رہی تھی۔ پھمّو جمّن نے اپنی سوکھی ہوئی کلائی اندر ڈال کر گھر کا کنڈا کھول لیا۔

وہ بلّی کی طرح دبے پاؤں چل کر ایک بستر والی کوٹھری میں جھانکنے لگی مگر عجمی نے اس کی آہٹ پالی۔ جب وہ انہیں دیکھ کر پلٹی تو عجمی نے اسے دروازے پر جا پکڑا۔ سامنے والی کوٹھری میں لے جا کر اس کا منہ اور کان لوگڑ ٹھونس کر اس طرح باندھ دیئے جیسے کسی جراح نے اس کی مرہم پٹی کی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی جوڑ دیئے گئے مگر ناگری کی رحم دلانہ سفارش پر اتنی رعائت برتی گئی کہ وہ ذرا اہل چل سکے۔ باہر سے کنڈی لگا دی گئی۔ اوسا سے بھابی کی چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔

کٹنی کو قابو کر کے ناگری اور عجمی اپنی اپج پر پھولے نہ سمائے اور وہ کوٹھری

میں واپس آ گئے ۔ انہیں اس واقعے سے ایسی خوشی ہو رہی تھی جیسے سرحد کے قبائلیوں نے دشمن کا دیکھ بھال کرنے والا طیارہ مار گرایا ہو ۔

راز چھپانے کا کوئی دوسرا جتن ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔ اور کشتی کو وہ کب تک جیسی بے جا ہیں رکھ سکتے تھے ۔ اس رات ناگری نے سنجیدگی کے ساتھ کہا : " میں نے تمہاری بات مان لی ۔ بس تم پاکستان نہ جاؤ ۔ "

" اس لئے کہ تو نے جو سات کبوتر مجھ پر تین تین بار وار کر اڑائے تھے ان میں سے ایک بھی نہیں لوٹا ، انہیں شکرے ترچھی کھا گئے ہوں گے ۔ "

" سب کو ؟ "

" ہاں ، سب کو ۔ "

" نہیں ، سوامی ، ایسا کب ہوتا ہے ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شکرے ترچھی ایسا بال بندھا نشانہ ماریں کہ سات میں ایک بھی پلٹ کر بچ کر نہ آئے ۔ اور اسی دن سے اوس پڑوس میں گرہ تک بھی تو نہیں اڑے ، وہ بھی کہیں گپت ہو گئے ۔ تیل میں چھیل چھبیلا ، ناگر مرتا ، بالچھڑ کی ملونی کر کے جو صدقے کے چراغ میں نے کل کرپا کے ہاتھ جوہڑ کے پر رکھوائے تھے ۔ وہ جھلملا جھلملا کر بجھ گئے اور ہوا سوئی ہوئی تھی بلکہ دم سا ہو رہا تھا ، انہیں بجھانے کے ... لئے بھیم وشال سے پتہ نہیں کیونکہ ایک جھونکا آ گیا ۔ پرسوں میں نے پجاری کے پاس گھی بھیجا تھا کہ وہ بھڑکتی ہوئی اگیاری پر ڈال ڈال کر پاٹھ کرے کہ میرا پیا ہونا کال یاترا سے جلدی لوٹے ۔ پجاری نے اگیاری پر گھی ڈالا تو ایسا لگا کہ جیسے پانی کے چھینٹے دیئے جا رہے ہوں ، اس سے آگ نہ

بھی تو نہ بھڑکی۔ آج جب تم صبح صبح سو رہے تھے تو میں دھیما مندر میں کلپ استھاپن کرنے گئی۔ ابھی جل بھر پانی بھی نہیں چھڑکا تھا کہ کلسا آپ سے آپ میرے ہاتھوں میں ٹوٹ گیا۔ میرا کلیجا دھڑکے ہے بھجی جی! تم مت جاؤ۔"

"تو تیری سیفی الٹ گئی۔ سفلی عملوں میں ایسا ہی ہو جاتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ لاکھ وشواش دیتی ہوں مگر بھنبر والا نہیں مانتا۔ امرود کے تھالے میں تلسی اور مروے کے گملے رکھے ہیں۔ انکی کلیاں مرجھائی ہوئی ہیں۔"

"تجھے تو وہم ہو گیا۔ میں تو ابابیل اڑنے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔ تو مجھے برسات کے بھائے سے پہلے یہاں دیکھے گی۔"

"اور جو برسات ہی نہ آئی؟"

"برسات نہ آئی، ایسا کب ہوتا ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے؟"

"بھجی کے اس فقرے پر ناگری کے ہونٹوں کی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں کھلیں اور بند ہو گئیں۔ پھر وہ مخن پروانہ انداز میں بولی: "برسات تو آئے گی، پر پچھیتے کا کیا ہوگا؟"

"پہلے روڑے ڈنڈے سے کرتی پھرنا۔" پھر بھجی نے کئی بار اس کا منہ چوم کر پوچھا:۔

"برسات تو آئی، پر دور دیس جانے والا نہ آیا تو پھر کیا کرے گی؟"

"اپنے منہ سے نہ کہو۔"

"فرض کیا ابابیل اڑی اور تیرا سوامی نہ آیا تو تو کیا کرے گی؟"

" گاؤں گی "

" کیا "

"منجھیلی رات کاری - پیا بن لاگے بوند کٹاری - پیا بن لاگے رین بھیانک منجھیلی رات کاری "

" دکھ کیوں گھبرائے ہے - جی نہ چھوڑ اور خرخشے میں مت پڑ - میرا وہاں جانا ایسا ہے جیسے برہمن بھگوانوں میں جا رہا ہو ، جیسے کوئی اپنی چیز محفوظیت کے لئے بنک میں رکھ دے - اس لئے جی بھاری نہ کر - وہ مسلمانوں کے لئے بسم اللہ کا گنبد ہے - "

" ہم ہندو ہیں - ہمیں سود بھی چاہیئے - کیا تم وہاں سے زیادہ لال لال اور بلوان ہو کر بہڑو گے - "

" تجھے ایسی ہی امید رکھنی چاہیئے - "

" تو تم ابابیل اڑنے سے پہلے ہی لوٹ آؤ گے - جو کالے میگھ والی برکھا رت میں اڑتی ہے - جب دیوالی کے دیئے چاٹ کر بل میں گھسا ہوا کوئی بھی سانپ اپنے بل میں نہیں رہتا - تم اتنی مدت وہاں کیا کرو گے ؟ آج کل جیئی اور بریسم کے کھیت کو نہاؤ میں نیگ لگی ہوئی ہیں - جیئی تو کئی جگہ پہلے ہی زور کے کارن کھیت میں گر تک گئی ہے - تم بریسم پر پھول آنے سے اور جیئی کی پانت بھری جانے سے پہلے ہی لوٹ آنا - "

بریسم پر پھول مئی میں آتا ہے اور جیئی اپریل میں کٹتی ہے - تو میں کا خیر

مالپرح تک آجاؤں ؟"

ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میری اچھا کا پالن کرنے کو دھانتی پڑنے سے پہلے ہی جیت بہار میں لوٹ آؤ گے ہجب ہوئے چل رہے ہوں گے۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو۔ نہیں، نہیں، سوامی میں اور تم کبھی بن میں جا چھپتے۔"

" یہ کہاں ہے "؟

اس جگہ سے ساٹھ میل۔ وہاں پہاڑ نظر نہیں آتے۔ ان پر پٹے پڑے دیودار ہی دیودار دکھائی دیتے ہیں۔ بس کہیں کہیں کوئی برف کی چوٹی ضرور دھوپ میں چمک جاتی ہے۔ گڑیال کا مزا وہاں ہے ؟ وہاں ہم گھیپ گھوڑوں کی طرح سنسان بن میں کھڑبڑ کھڑبڑ کرتے پھرتے۔ گھیپ گھوڑوں کی طرح نہیں بلکہ جنگلی گھوڑوں کیطرح کودتے پھاندتے پھرتے۔ لیکن میں اب تمہارا دو چار دن کا مہمان ہوں، ناگری۔ مگر......"

" مگر کیا، سوامی ؟"

" وہ مجھے پکڑ لیں گے۔ میرے بچ نکلنے سے کیا فائدہ ؟"

" تو، سوامی، مجھے بھی اپنا سبھاگا پاکستان دکھلا۔"

" تو وہاں کیسے جا سکتی ہے ؟ وہ مسلمانوں کا ملک ہے۔"

" تو میں بھی مسلمان ہوں گی جی، جیسے آپ اچھے ویسے ہی آپ کا مذہب دھرم بھی اچھا۔ مجھے اپنے جوتے میں سکھ تلے کی جگہ رکھ کرلے جاؤ۔ جو تم مجھے بول بھی نہ سکے گے تو میں سرسوتی کیطرح تمہارے قدموں تلے بہتی ہوئی چلی آؤں گی : مان لے شیام مدی کہی ہے۔ جو بھارت نے پاکستان کو کہیل

دیا تو میں انہیں منمنے کیطرح رل کر چلی آؤں گی۔ بولو، تم مجھے کیسے روکو گے؟
میں تو را پکشی ہوں۔ جو اپنے ساتھ کونجوں کیطرح ایک پانت میں نہیں لے جا
سکتے تو بستی چڑھے ہوئے پنجرے میں ڈال کر لے جانا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا
برمی لاجونت اور بھڑکیلی چڑیا ہے۔ رونق اور اجیالے سے گھبراتی اور بدکتی
ہے اس لئے یوں لئے جا رہا ہوں۔"

"پکشی جی، میں نے گوری کہی مان لی۔"

"تو دان دکھلوا لوں؟"

"دکھلائیے!"

"بھور بھی بانٹوں گی۔"

"بانٹ دے۔"

۶

ناگری اس وقت وفورِ انبساط سے ایسی بن گئی تھی جیسے دوپہر میں سورج
مکھی کا پھول۔ خوشی کے مارے اس سے بولا تک نہیں جا رہا تھا۔ اس کا رواں
رواں کھل اٹھا تھا۔

وہ گویا کو لانگ پھلانگ بستر سے کود کر باہر آ گئی۔ اس کا باپ دکان
بڑھا کر آنے والا تھا۔ رسوئی گھر میں جا کر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ اترا کر
دبیرے مسکاتے ہوئے بلا سوچے سمجھے اپنی بھابی سے کہنے لگی: "بھابی،
بھابی، بھابی جی!"

" کچھ تو نے پڑا پایا ہے جو اتنی خوشیوں میں آ رہی ہے ۔"

" بھابی، بھابی، سنو تو۔ دیکھو میں تمہیں کیا سنانے آئی ہوں۔ میں کتنی نچھتری ہوں۔ میرا کپاں کھل گیا۔ بھور باٹھوں گی۔ ایسا پنڈت کہاں ملے گا؟ "

" کیا کرنا ہے ؟ "

" من دکھلواؤں گی ۔"

" کس کارن ؟ "

" ہم بھی پاکستان جا رہے ہیں۔ "

" کون کون ؟ "

" بس میں اور وہ ، پکشی جی بھی آخر پاکستان چل ہی دیئے ۔"

" یہ پکشی جی کون ہیں ؟ "

" بھابی، انہوں نے قائد اعظم کا پکش لیا پاکستان بنوایا۔ وہ قائد اعظم کے پکشی ہیں اور میں ان کی پکشی ہوں۔ وہ آور کے کارن مجھے پکشی جی کہتے ہیں ۔"

" ٹلّی، حل المٹی، یا بیوں جو گی، اتنا کسی پہ نہیں مر مٹا کرتے ۔"

" بھابی میں تو ان کے سنگ جاؤں گی، پر جاؤں گی بھابی، وہ تو میرے گرو ہیں، میں ان کی بالکی، میں نے پاکستان کا ووٹ ڈالا تھا۔"

تعجب ہے انہوں نے یہاں ڈیرے ڈالے تو تو کھلو با ذلی سی بن گئی۔ تیرے منہ پہ پھٹکار سی برس رہی ہے تیرے ہونٹوں اور گالوں پر

کمرو نہیں آتے ہیں۔"

"ملں بھائی، میرے منہ پر تو اسی دن سے پھٹکار برسنے لگی جب میں نے تمہارے بھائی کے ساتھ سانے کی سگائی سے انکار کیا تھا۔"

اس نوک جھوک اور کھٹا پٹی سے ناگری کی مسروری میں رخنہ نہ پڑا۔ وہ بھاگی بھاگی ٹمی کے پاس لوٹ آئی اور اسے سے جلدی جلدی جھنجھنیاں اور چھاگل اٹھا کر پہنے۔ اس نے ٹمی کی سبز کشتی نما امیوری ٹوپی اور اچکن بھی ٹھاٹ لیا۔ وہ اسی چھپی سی جگہ میں زور زور سے پاؤں فرش پر مارتے ہوئے چھم چھم کرتی پھرنے لگی اور ذرا نلوح کر ٹمی کو دکھایا۔

آج کھلی میرے من کی کلی
کھلی کھلی کھلی آئی کھی کلی!

اتنے میں اس کا بڑا بھائی کمند ابھی آگیا اور جب چوکے میں بیٹھ کر بھنے نے ناگری کے ارادے معلوم ہوئے تو وہ اسے سمجھانے اور کرتہ کرنے لگا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے مجھے سگرٹ فیکٹری میں ملازمت دلوائی تھی پتاجی کو دکان کا سامان خرید کر دیا تھا۔ اور کرپا کر پڑھا رہے ہیں مگر ناگری، ہم تجھے ایک سے لاکھ تک ان کے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ تو ان کی مولڑ نہیں۔ انہیں ابھی جا کر کہہ دے کہ صبح اندھیرے اندھیرے دہلی جانے والی گاڑی میں سوار ہو جائیں۔"

"بڑے بھائی جی، اگر وہ چلے گئے تو یہ مجھ جو میٹھی ہے ..."

"مدعا نہ رہے گا تو ہم کسی طرح اس سے نپٹ لیں گے۔ تو جا انہیں

یہ بات سنا دے۔

وہ کوٹھری میں گئی تو اس کے برجستہ برجستہ خوش آیند چہرے پر دل بستگی اور فکر ہائے دور و دراز کے آثار ظاہر تھے۔ اس کی فرح ناکی اور دل لگی ہوا ہو چکی تھی۔ جب بھی شریک الرائے ہو کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہو گیا تھا تو اس کے گھر والے رکاوٹ بن گئے تھے۔ وہ اپنے باپ کے آنے پر بھی باہر نہ گئی اور کھانا جو کچھ تھوڑا بہت اس کے حلق سے نیچے اتر سکا، بھی کے ساتھ کھایا۔

بھی نے اس کی حالت دیکھ کر کہا: "تیری صحت روکھی روکھی، بھنگی بھنگی سی ہو رہی ہے۔ نظر کا جادو اڑا اڑا سا، ہونٹ الونے الونے سے، اور ہنسی ہے پر کھوکھلی ہماری یہ آخری صحبت بھی غنیمت ہے۔ گھنٹی کی طرح ٹھنک۔ اپنے پرانے داؤں پھر دکھا! ایسی بن جا جیسے دو چلّوؤں میں بہک کر بجا مجھ سے مری ہماری ہو۔ ہنس، ناگری! میرے لئے ہنس۔"

پھر ناگری کو چھوٹے چھوٹے قہقہے لگانے پڑے۔ اس کی شرارت آمیز آنکھیں بار بار بند ہو کر کھل رہی تھیں۔ لیکن اس سے بھی کی تسلی نہ ہوئی:

"تو چپ کیوں ہے؟"

"جو رات کی رات کا مہمان ہو، اسے دکھ دینا اچھا نہیں ہوتا۔ تم..."

"پھر رک گئی۔"

"جو من میں ہے میرے منہ میں اس کے لئے بول نہیں۔ اچھا! بکھنی جی! تم وہاں پہنچ کر کیا بیراگ سادھ لو گے اتنی سستی ہو جاؤ گے؟ دوستوں کو کیسم

کسل کے خط تو لکھا کرو گے ۔"

"ہاں !"

"اور مجھے ؟"

"تجھے نہیں"

"جو میں نے کوئی پتر ڈالا تو جواب بھی نہ ملے گا ! خیر نہ ملے ۔ پر ایک بات تو کر سکتے ہو ۔ منظور ہو تو بتاؤں ۔"

"بتا !"

"کورے کاغذ پر چلک کا نشان کر کے بھیج دینا ۔"

"میں ایسا بھی نہ کروں گا ۔"

تم ایسا کرو گے تو اپن ایسا کریں گے کر دھیا منمد کی داسی بنیں گے ۔ گو کھی سامنے دھریں گے اور مالا جپا کریں گے ۔ اور جو ہمیں مندر میں جگہ نہ ملی تو اسی کوٹھری کو جبر گاس بنائیں گے ۔"

تمہیں پتہ نہیں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں ۔ وہاں مجھے خیالات تک کی پاکیزگی درکار ہو گی ۔"

"دو داسی جی ، کیا اپنا آپا اتنا لبسرالو گے ۔ اور میں گویا آنکھوں سے دور ہو کر من سے بھی اتر جاؤں گی اور تم مجھے بیٹے کھاتے ہی ٹال دو گے ؟"

"ہاں !"

"ایشور ایسا تو نہ کرے ، کیوں کہ یوں بڑے بڑے تو کر جاؤ گے ۔ زیادہ دنوں چاپ چڑھانے سے پشو چرنا اور جگالی کرنا بھول جاتا ہے اور تم

جانتے ہو میں کون ہوں۔"

"ڈولی پچھلی!"

"میں وہ ہوں جو تمہیں پرانے، سنسان نمائش گھر میں ملی تھی۔ جب جھاؤٹیں برس کر کھلا تھا۔ جبو نے جھونے بادل چھپا ؤ میں اڑ رہے تھے اور اتنی سردی تھی کہ دھوپ میں آنچ کا پتہ تک نہ تھا۔ تم نے وہاں میرا ہاتھ کیوں پکڑا تھا؟"

"اور تو نے اسے چھڑایا کیوں نہ تھا؟"

"اور جب میں نے پوچھا: کیوں کیا بات ہے؟ تو تم نے اس کا یہ جواب کیوں دیا تھا: کوئی بات نہیں۔"

"تو بات تو کوئی نہیں تھی۔"

"جو بات..... کوئی نہیں تھی۔ تو پھر تمہیں اس سے تھر تھری سی کیوں چھوٹ رہی تھی؟"

"اور تو بند کئے ہوئے پھاٹک میں جس پر سواگتم لکھا ہوا تھا، غضب کی پھپاہٹ میں آکر بلا ضرورت یوں ہی گھاٹ نکلنے کیوں لگی تھی؟"

"تمہیں وہ ٹھسکا ابھی تک یاد ہے؟"

"مجھے وہ ٹھسکا ہمیشہ ہی یاد رہے گا۔ اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"تمہیں اس دن تھر تھری کیوں چھوٹ رہی تھی، اور تم مجھ پر ٹیڑھی سی نگاہ کئے کھڑے ہو گئے تھے: کیوں جی؟"

"تھر تھری جو چھوٹ رہی تھی۔ مگر نہ جانا جی؟ اور تو اس دن جگنی اور پھلا

پورن کی طرح گا رہی تھی : سیاں توری گودی میں گیندا بن جاؤں گی ۔ آج بھی گا !"

"گاؤں گی ، جو تم میرے ساتھ گاؤ ، جس طرح جگنی اور پھلوا پور نہیں گیا کرتی ہیں ۔" پھر وہ گنگنانے لگی :۔

"سیاں تیری گودی میں گیندا بن جاؤں گی
جو مورے سیاں کو پیاس لگے گی گنگا جمنا ریتی بن جاؤں گی "

"اور میں وہ زمانے کبھی نہیں بھولا جب ٹیسو کے دنوں میں سوراخ دار ہانڈی کے اندر چراغ جلائے اور اسے سر پہ دھرے تو جھانجھی والی ہندو لڑکیوں کے ساتھ گیت گاتی پھرا کرتی تھی ۔"

" تو پھر ہمیں من سے اتار کر کسی اور کو من میں نہ بسا لینا ۔ مجھ ایسی دل کی سادی لڑکی تم کو ملنے کی بھی نہیں ۔ اچھا جی جی ، تمہیں میری کوئی اور چیز یاد آئی تو کیا یاد آئے گی ؟"

" تیرا لہرانا ۔"

" اور کچھ نہیں ؟"

" اور کچھ نہیں ۔ کیونکہ تیرے پاس یہ ایسا منتر ہے کہ جس کا اتار ہی نہیں ۔"

(۷)

یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ناگری کی بھابی نے دروازہ کھٹکھٹایا ، اور سرگوشی کی : " تیرے بھائی جی نے گلا گھونٹ کر بھرے کٹنی کے پران پھر ٹا دیئے ۔

وہ مری پڑی ہے۔"

"مری پڑی ہے؟ ہائے بھائی جی!"

"اس کے پران پھیڑ ادیئے اور کرتے بھی کیا۔ اور دیکھ، اپنے بلم کو کہہ دے کہ اب چلا جائے۔ تیرا بھائی چمو کی لاش سنگوائے گا۔"

"پر بھابی، آدھی رات ہونے آئی۔ اب وہ گھر سے نکلے تو کہیں ڈنڈے والے سپاہی ان سے سوال و جواب نہ کریں۔"

"محلے میں نوٹنکی کا تماشہ ہو رہا ہے۔ یہ ڈھولک اور گانے کی آواز نہیں آ رہی؟ اچھا موقع ہے۔ نکل جائیں کوئی پوچھے تو کہہ دیں گے: تماشہ دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

اندر جا کر وہ متوحش اور بے کل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، اداس جی سے گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی، "سوامی بھائی جی نے گلا گھونٹ کر چمو کمنی کے پران پھیڑ ادیئے۔ وہ مری پڑی ہے۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ میاں بیوی کی میری وجہ سے کتنا ٹھنی ہو گئی۔ پہلے اس بچی ہوئی کوٹھری میں سویا کرتے تھے۔ بعد کو اس کوٹھری میں رہنے لگے۔ اور جب چمو وہاں آ بیٹھی تو یہ بیچارے کہاں جائیں؟ خبر نہیں، دونوں میں کب سے ہانڈی پک رہی ہو گی کہ مجھے کیسے راستہ دکھائیں۔ میں انہیں دو بھر ہو گیا ہوں۔"

"نہیں سوامی، وہ مری پڑی ہے۔ بھائی جی اسے سنگوا دیں گے۔ تم جاؤ۔ جانا ہی اچھا ہے۔ کہیں تم پہ خون کا الزام نہ لگا دیں۔"

"وہ مری نہیں۔ سند چاہے تو کوٹھری میں جا کر دیکھ آ۔"

"میں! مجھ سے کوٹھری کی طرف دیکھا بھی نہ جائے گا۔ سوامی، اٹھو! سب کھیل بھنڈ ہو چکا۔ دیپک کی بتی جل چکی۔ تمہارا اندھیرا اگ رہا ہے۔ میں تمہیں اپنے گھر سے کھیدڑ رہی ہوں۔ تمہارے دم قدم سے یہاں آبادانی اور ہریالی تھی۔ بہت دنوں کچھ تر رہ چکا۔ اب مجھ میں یہ مقدور ہی نہیں کہ تمہیں ٹھہرا سکوں۔ پرماتما کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں اشیرباد دے رہی ہوں۔ ایشور تمہارا بول بالا کرے، یوگیوں کو بھر لائے۔ جو تمہارا پنچھی پاؤں پیٹ پیٹ کر نہ مرا اور باٹ دیکھتے دیکھتے آنکھیں نہ ڈھلکیں تو ایک دن درشن ہو ہی جائیں گے۔ دیوتا کو من کی آس میں بٹھلا کر پوجا کرنے کا سماں آ رہا ہے۔ پھول بتاشے چڑھانے کا سمے سہاپت ہوا۔"

"جو تمہاری آگیا ہوتی تو میں گنگا منہ میں رکھ کر تمہارے پاس اڑی چلی آتی۔ وہ نہ ملتا تو دیسے ہی بے جوگ اور بھاگا بھاگ پہنچتی۔ اور تمہارے گھر آن پڑتی۔ تمہارا یہاں اتنے دنوں ٹھہرنا بھی اس جنم جلی کی دھک دھکی نہ مٹا سکا۔ میں ایک رات بھی کھٹکے کو اٹھول نہ سو سکی، اور سنتوش تو کہاں۔ مجھے ایسا جان پڑتا رہا جیسے میری کمر پہ کنکھجورا چڑھ گیا ہو اور ابھی ابھی اپنے پیر میرے ماس میں گڑو دے گا۔ ایسی چل چلاؤ ملاقات میں کیا مزا۔ بھول سے ہو کر ملیں تو سواد اس میں ہی ہے۔ رام جانے یہ سمے کب آئے گا اور اب تو کڑوے کسیلے دن شروع ہوا چاہتے ہیں۔ یہ دل تو ابھی سے پسا جا رہا ہے۔ آگے جا کر کیا ہوگا: جب اس میں غم کی چھاؤنیاں پڑ جائیں گی۔"

اب پوس گزر جا رہا ہے۔ پھاگن میں آرت کے مکوے کھلیں گے۔ چیت میں آم مہکے گا۔ بیساکھ میں طوطے تن کے کوٹر میں بچے نکالیں گے۔ پھر وہ تپے گا کہ دھرتی لال ہو ہو جائے گی۔ ساون روتا ہوا آئیگا، روتا ہوا جائے گا، سلونو کی مجھے خبر تک نہ ہوگی۔ میں تو یہ بول گاؤں گی، دن رین آنسو بہاؤں گی :"

لگا میگا جھم جھم میگھ برسے ہمی کا جیو یہ دیکھن کو ترسے
چڑھا ساون، گئی آنے بھنبھیری نہ آئے کنتھ اب تک اے سکھی سی
اندھیری رین، برسے ہے گھنگھور کریں ہیں داور اجھنگرائے کے شور
سکھی جب کوک کوئل کی سنت ہوں اٹھا کے سیس ماتی پہ دھرت ہوں
چلا ساون بھی اب دکھ دے کے روتا نہ آئے پی، رہا منڈل پہ سوتا

تم نہ آئے تو میں کانگ سیں کو واجب تھ مناؤں گی۔ ہائے، دودھ پار، ایسا کر نہ ہو تمہیں چیت میں رام نومی یہیں آکر کرنی چاہیئے۔ ہولی پھکنے سے پہلے ہی آجانا۔ پھر ہم دونوں دھنڈی منائیں گے۔ تم مجھ پر رنگ بھری پچکاریاں چھوڑ کر اپنی رانی بازار والی حویلی میں چلے جاؤ گے، تو میں پیچھے گاؤں گی :۔ ساتوں سوار گیا موہی اٹھکھن پیچ عبیر۔

"سوامی" مجھ سے ایک دن بھی پھیل پھیل کر نہ سویا گیا۔ میں کبھی ترپت نہ ہوئی۔"

"پھیل پھیل کر کیسے سوتی؟ جب ایک بستر میں دو ہوں تو پھیل پھیل کر نہیں سویا جایا کرتا۔ اور وہ کیول دو ہی ہے؟ اسی لئے؟"

"نہیں، اس لئے نہیں! اگر میں کا رونا ہے۔ بہیترا دل کڑا کیا، پھر بھی کچھ ٹیسوے ٹپک ہی پڑے۔ آنکھیں بھی کھٹک رہی ہیں۔ میں وہ سات پنچھی مار کر نہ ہی اڑاتی تو اچھا تھا۔ کچھ تو آس رہ جاتی۔ دل میں اتنا دھواں تو نہ اٹھتا۔ جب تم نے کہا تھا میں ابابیل اڑنے سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ تو میں نے وہ ابابیلیں بھی کوٹھے پر جاکر اڑائے تھے۔ وہ تک بھی تو نہ لوٹے۔ بس بیوگ پڑنے والا ہے۔"

"ایسی اول جلول باتیں کر کے اپنا جی نہ بھاری کر۔"

"ایشور کرے تم وہاں اچھے بھلے پہنچو۔ تمہیں وہاں رہنا لمنا اور لاج رہنا نصیب ہو، میرے کون سے پران نکلے جا رہے ہیں۔ تم بن اکلاؤں گی ضرور، دم بھی پھڑکے گا! مگر کال یاترا کے کا لے کوس پھر بھی کٹ ہی جائیں گے۔"

۸

بجلی باہر چلا گیا اور اندھیری کوٹھری کی تلاشی لینے لگا۔ بھائی اور بھابی کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ پھتو کٹنی کا وہاں پتہ بھی نہ تھا۔ اگر وہ مل جاتی تو بجلی ضرور اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

پھتو کو موجود نہ پا کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ سانس چڑھائے ہوئے کوٹھری میں جا کر ناگری سے بولا "وہ تو وہاں سرے سے ہے ہی نہیں۔"

وہ گھبرائی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے کوٹھے پر کمندا کو بلا کر کہا: "بھائی جی، وہ ...."

"میں نے گلا گھونٹ کر اس کے پران چھڑوا دیئے، اب اسے جلدی ہی سنگوانا ہے۔"

"پر بھائی جی ......"

"تو کہہ دے، وہ نکل جائیں۔ یہ زلمکی کا تماشہ ہو رہا ہے۔ اچھا بہانہ ہے۔"

"پر بھائی جی، وہ وہاں کوٹھری میں نہیں۔"

یہ سن کر کمندا عجیب انداز میں بولا: "بے وقوف، مری ہوئی کہاں جا سکتی ہے؟ میں نے تو چارپائی پر ڈال کر اس کا گلا گھونٹ دیا تھا جھوٹی کہیں کی۔ تو اسے دیکھنے جا کیسے سکتی ہے، ڈرپوک، پاتسا گھا بری؟"

"میں نہیں گئی، وہ گئے تھے سامنہوں نے کوناکو ناچھان مارا۔"

"اچھا جلا میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔ تو انہیں میرا پرنم دے کر کہہ دے کہ وہ فوراً چلے جائیں۔"

ناگری فوراً چلی گئی۔ کمندا نے کوٹھری کو پہلے تو اندھیرے میں ٹوہا اور بعد کو دیا لگیرے کر دیکھا جاہ ہمو گئی کوئی سوئی تو نہیں تھی۔ کوٹھری کا بہت سا سامان بھی غائب تھا۔ مگر جلد ہی اس کی نگاہ دیوار کے پاڑ پر پڑ گئی۔ یہ اس کے جاگنے کا لاستہ تھا۔ اس نے سیدھا لگائی کیسے ہوگی؟ ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوئے تھے۔ آلات نقب زنی کہاں سے آئے؟

پھر اس نے عقل پر ذرا سا زور دیا: "یہاں تو چور آئے تھے۔ نقب باہر سے لگائی گئی ہے۔ ملبہ تمام باہر ہی ہے۔"

لکمندا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ کشتی کی کہانی گھڑنے میں ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ وہ واقعی ایک دوسرے کو ترس گئے تھے۔ ان کی شادی دیوالی پہ تو ہوئی ہی تھی اور ابھی ہولی میں مہینے بھر سے زیادہ پڑا تھا۔ پر اب خطرہ انہیں بالکل نزدیک نظر آیا۔ مغرور ملزم ناگری کے پاس سے پکڑا گیا تو گھر بھر کی خیر نہیں تھی۔

لکمندا نے اپنی بیوی کو بھیجا کہ وہ ناگری کو کہے کہ بھجی کو فوراً چلتا کر دے۔ کچھ دیر بعد وہ ناگری کو سنبھالے ہوئے لا رہی تھی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ تبارے ہی فرش پر گر گئی تھی۔ اس کے گھٹنوں سے خون نکل رہا تھا۔ پھر لکمندا کوٹھری میں گھس گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا: "بھجی جی، بڑا غضب ہو گیا۔ جیسل نے سیندھ لگائی تھی .... وہیں سے بھاگ گئی۔ پولیس آیا چاہتی ہے۔ جلدی کیجئے۔" وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے ناگری بھی دھاڑم دھاڑ روتی ہوئی گلیارے میں دوڑ گئی۔ وہ پیٹتی ہوئی آدھ ڈیوڑھی میں بین کر رہی تھی: "ہائے، جوگی بنا منڈھیا سونی ہو گئی۔ باگ باڑی اجڑ گئی باڑی اجڑ گئی۔ مجھے سسکتی کو چھوڑ گئے۔ ہے ہے میرے پران ان کے سامنے ہی نکل جاتے تو اچھا تھا۔ جس کے لئے اپنا آپا تجا تھا۔ وہ جیمپ چلا گیا۔"

لکمندا سے رو کنے کے لئے بھاگا کہ کہیں یہ بھی بھجی کے ساتھ نہ چل دے۔

مگر وہ سفر خرچ کے لئے چپکے سے سو روپے کا نوٹ، زادِ راہ کے لئے رومال میں بندھے ہوئے بوندی کے پاؤ سیر لڈو عجمی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے واپس آ کر کوٹھے پر چڑھ گئی تاکہ گیس کی تیز روشنی میں نوٹنکی کے تماشے والوں کی بھیڑ میں عجمی کو جاتا ہوا دیکھے۔ وہاں سے اسے عجمی تو نظر نہ آیا مگر سامنے زہرہ ستارہ اماوس کی رات میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے اس نے آسمان میں چھید کر دیا ہو۔ ہندو زہرہ کو منحوس مانتے ہیں۔ وہ یہ کہتی ہوئی نیچے آ گئی: "پیا کو بدا کیا تو سوگ سامنے ہے۔ رام بھلی کرے۔ میرے من کا نگ اچھلتی ہوئی گنگا کی منجدھار میں گر پڑا۔ اب اسے کون نکالے۔" وہ ابھی سیڑھیوں ہی میں تھی کہ یاہو بولنے لگے۔ ان کی آواز بھی بڑی شیون آلود اور درد بھری تھی۔

ذرا دیر بعد ڈھولک اور گانا بند ہو گیا۔ نوٹنکی کا تماشہ دیکھنے والے مجمع کو سڑک سے ہٹاتی ہوئی مسلح پولیس کی دو لاریاں گھڑگھڑاتی ہوئی سرداری کھٹیک کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ گھر کا محاصرہ کر لیا گیا اور بلا آواز یا اطلاع دیئے جوشی تھانے دار مع پولیس کپتان اندر داخل ہو کر سیدھا ایک مسہری والی کوٹھری میں جا پہنچا۔ وہ اب بھی اگربتیوں، ہار گجرے سے مہکی ہوئی تھی۔ ناگری کا سنگھار دان کھلا ہوا تھا۔ ناگری ہچکیوں ہچکیوں روتی ہوئی اس میں سے عجمی کے دو پاسپورٹ سائز فوٹو نکال کر قمیص میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جوشی نے جاتے ہی اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر تلاشی لینی شروع کر دی اور سب سے پہلے فوٹو برآمد کر لئے۔ پھر اس نے بستر ٹٹولا۔ وہ گرم تھا۔ کمرے میں تازہ پان بنے رکھے تھے۔ مگر تمام آثار مستحقین کی مخبری کے مطابق موجود ہوتے ہوئے بھی معا

غائب تھا۔ لیکن ناگری جرم اخفا بالعمد کی مرتکب ہو چکی تھی۔

کچھ دیر بعد نوٹنکی کے تماشائی سرداری ٹھیٹک کے تمام خاندان کو جالیوں والی لاری میں جاتا ہوا دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ گو سڑک پر گیس کی تیز روشنی تھی مگر نظر خاک نہ آسکتا تھا۔

ناگری نے اس وقت گوٹی کرتی پر سونے کی دھاریوں والی جیکٹ پہن رکھی تھی اور منقش والا کسمبھ رنگ لہنگا۔ اس کا آفت روزگار چہرہ فق ہو کر چھوٹا سا نکل آیا تھا۔ پہاڑی جوشی اس کی اس طرح نگہبانی کر رہا تھا جیسے اس نے قتل عمد کیا ہو۔ اس کی سات سہیلیوں کے جھمکے سے بھی زیادہ چمکدار آنکھیں رونے کے سبب الٹی ہو گئی تھیں۔ رنگ پریدہ پریدہ، ژولیدہ ژولیدہ اور جوڑا کھلا ہوا۔ وہ ایک ہاری دکھیاری اور یتیم دوشیزہ نظر آرہی تھی۔ وہ گھنڈ میں لکڑی ہوئی ایسی لاوارث بیری معلوم ہو رہی تھی جس کے بیروں پر صبح سے شام تک شریر بچوں کا گودھڑا برستا رہا ہو۔ اور وہ گھسٹتی ہوئی چھوڑ دی گئی ہو۔ رونے کے سبب اس کی اب بھی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

ادھر محل کے پھاٹک پر پولیس لاری کے انجن میں فرق آگیا۔ جب لاری ٹھہرا کر انجن ٹھیک کر رہے تھے تو نوٹنکی کی محفل پھر جم گئی۔ اس وقت ہیجڑے تالیاں بجا بجا کر گا رہے تھے۔

جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں!!
ننڈا بھی ڈھونڈے سا سو بھی ڈھونڈے
سیاں ڈھونڈے سے مٹی کا دیا بال بال

جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں !

گارڈ کے سپاہی اس گانے کی مقامی اور بانکی دھن پر لاری میں بیٹھے ہوئے تالیاں بجانے لگے اور پہاڑی جوشی نے مستی میں آ کر اپنا ہاتھ ناگری کی سانتھل پر رکھ دیا۔ ناگری کچھ بھی تو نہ بولی اور نہ ہاتھ پر سے ہٹایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا جھمکا تو کہیں بیکری یا لکھنؤ کے بازاروں میں جا کر گرے مجھ اس کا یہ جھمکا بریلی یا لکھنؤ کے بازار میں گرتا تو وہ اسے ڈھونڈ ہی لاتی۔ وہ منہ ہی منہ میں گا رہی تھی :

جیا اٹک رہا ہے تجھ میں
ترے درس کو نین ! !

(سویرا لاہور)

الائچی دانہ

مجبوب ملازم نے پٹ کھولتے ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا: "کوئی باورچی خانے کی طرف چور کھڑکی کھٹکھٹا رہا ہے۔ پتہ نہیں کون ہوگا۔ اسے کھٹکھٹاتے ہوئے دیر ہوگئی ہے، بڑی سہج سہج کھٹکھٹا رہا ہے۔" میرے دل نے فوراً کہا "الائچی دانے والی آگئی۔" واقعی وہ آگئی تھی۔ میں اسے چپ رکھ کر کی سے ہی گودی میں اٹھا کر لایا۔ کمرے میں بجلی کی ٹیوب کی تیز مہتابی روشنی تھی جس میں پھول دار جامنی قالین دہک رہا تھا۔ جب میں نے اس پر سے نجانے کی سمند لوئی اتاری تو دیکھا۔ اس نے لباس تیراکی ایسی ریشمی شمیز پہنی ہوئی تھی، جس کا رنگ پہاڑی کستوروں کے پروں ایسا تیلیا نیلا تھا۔ اس کے گریبان، پلوں اور کفوں پر تسبیح کے امام ایسے دانے جھالر کی طرح آویزاں تھے۔ نچلے حصہ پر بھی اس قسم کا نیکر نما جانگیہ تھا۔ وہ خوب بناؤ کر کے آئی تھی۔ اس کے جسم کی جھلکا جھلک چکناہٹ اور بلور کو کیا کہیے سا آئیوری کوسٹ میں جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے اگر ہاتھی دانت کی تجارت ہوتی ہوگی تو وہاں کے تاجر ایسا مگر ہاتھی دانت آج تک کبھی یہ آمد نہ کر سکے ہوں گے۔ میں نے تمہیداً

اس کے نچلے ہونٹ کا ابھراپن سانگرنی شیشہ چومتے ہوئے گدے دار بستر میں دھنسا دیا۔ اس بستر کی ریشمی چادر گاڑھے مکھن کے ہم رنگ تھی جس میں سبز، سرخ اور زرد پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پہنی اوڑھی وہ پتلی سی معلوم ہوتی تھی لیکن یوں لیٹے ہوئے اس کا جسم بھرا بھرا لگتا تھا۔

ہندو لوہڑی کا تہوار منا رہے تھے۔ جس طرح مینہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس زور کا برس رہا تھا کہ آج برس کے پھر کبھی نہیں برسے گا اسی طرح سردی اتنی پڑ رہی تھی کہ جتنی بھی پڑنی ہو بس آج ہی پڑ رہے۔ ہفتہ بھر مہاوٹ برسنے کے بعد شام کھلا تھا۔ ایسی دھوپ چل رہی تھی جیسے یہ پتوں کو چھلنی کر رہی ہو۔ دھند میں آیا ہوا اکادش کا چاند تنک کا نتا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ شملہ سے سو میل اوپر پہاڑوں کا رہنے والا گرمکھ سنگھ چوکیدار اپنے سمور دار اوور کوٹ میں آتنا جاڑا محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے سوسی کی معمولی روئی دار جیکٹ پہنی ہوئی ہو۔ مگر میرا کمرہ ہیٹر کی بدولت ایسا گرم تھا کہ جب مہمان کی شمیر کے فتوحی نما بٹن میرے ہاتھوں پٹ پٹا کر کھلے تو اسے ذرا بھی جاڑا نہ لگا۔ مجھے وہ اس اٹک دم باز کبوتر جیسی معلوم ہوئی جسے صبح کو اڑائیں تو شام کو اترے اور سردیوں کی ٹھنڈی دوپہری میں دور آسمان پر کالے بادل تلے سفید تارا سا لگے۔ اس کے جسم پر ایک رتی بھر گوشت زیادہ نہ تھا اور نہ ہی کم تھا۔

ہمالہ اور اس چہرہ کھڑکی سے آنے والی گنگا کا ٹیج دونوں اس طرح سے پاس پاس تھے، جیسے مندر کے دو .... چھوٹے بڑے گنبد۔ ہمالہ کا گیج بلند زیادہ تھا اور ان کا زیادہ وسیع۔ شمال میں تارکوں کی سڑک تھی، جنوب مغرب

میں پانچ میل اوپر درہ ساویریاں سے نکل کر اس اڑ بڑ پہاڑی تک پہنچتی تھی۔ جسے " دل عاشقاں " کہتے تھے۔ اس پہاڑی کے کٹھیلے الیسی سپاٹ مسٹک کی چار کھونٹوں سے چار چشمے پھوٹتے تھے۔ بیچ میں سدا بہار یودارون کی گنڈی تھی۔ یہی چار چشمے یک جا ہو کر مسٹک سے بشکل آبشار زاویہ قائمہ بناتے ہوئے پائیں کوہ پر گر کر ٹیڑھے میڑھے نالے میں مل جاتے ہیں۔ اس آبشار کی آواز دور دور تک جاتی تھی۔ جو محبت کے بندے اسی اڑ بڑ پہاڑی پر اگی ہوئی تلخ پریم بوٹی ایک دوسرے کے ہاتھ سے بلا منہ بنائے ہوئے کھا لیتے تو ان کا رشتہ اٹوٹ ہو جاتا تھا۔ لیکن جو ان میں سے ایک بھی منہ بنا لیتا تو پریم بوٹی ان دونوں کے لئے ہمیشہ کو بے اثر ہو جاتی۔

تارکول کی سڑک کے پار گوردوارہ تھا۔ گوردوارے سے ملحق وہ سبزار فٹ سے زیادہ اونچی یودارون سے ڈھکی پہاڑی تھی۔ جس سے نکل کر فتح پنجاب کے زمانے میں سکھ چھاپہ ماروں نے لال کرتی رجمنٹ کے تہرمان دستے کا صفایا کیا تھا اور پہاڑی برطانوی توپیں چھینی تھیں۔ آج اسی گوردوارے میں جس کا گرمکھ سنگھ چوکیدار تھا فتح خالصہ کی یاد منائی جا رہی تھی۔ دیوان منعقد تھا۔ طلبہ ہارمونیم پر بھجن گائے جا رہے تھے۔ اور الیسی سنا موش فضا میں جب کہ یہاں سے چند میل دور درہ ساویریاں برف سے اٹ کر بند ہو چکا تھا۔ اور وہاں اب اکبری پڑ رہی تھی، مذہبی گانا ہمارے کمرے میں ساحل پر آ کر کمزوری اور بے طاقتی سے مرتی ہوئی لہروں کی طرح سے داخل ہو رہا تھا یہ گویا ہمارے رومانوی ملاپ میں پس منظر کی موسیقی تھی۔ جنوب مغرب میں

دل ماشقان سے آنے والا ٹیڑھا بیڑا پہاڑی نالہ دھاں دھاں کرتا ہوا گزر رہا تھا۔

جب میں آنے والی کی خفگی دیکھ کر بے تابانہ پیش دستیاں کرنے لگا تو وہ مچھلی کی طرح بستر میں سے تڑپ کر اٹھی اور آرام کرسی کے چوڑے ہتھے پر بیٹھتے ہوئے بولی:۔

"ہے ہے ہے وندمت مچاؤ۔ دنگے بازی مت کرو، آؤ کچھ باتیں کرلیں۔"

"تم کوٹھے سے میرے الائچی دانے کیوں مارا کرتی تھیں؟"

"تم کیوں انگنائی میں دھوپ سینکتے ہوئے ہمارے کوٹھے کی طرف دیکھتے رہا کرتے تھے؟"

"تم سے ملنے کے لئے۔ تم نے کبھی اشارہ تک بھی تو نہ کیا۔"

"کرتی کیسے؟ وہ جو ہر وقت ساتھ ہوتی تھی۔"

"کون گندمی رنگ کی لڑکی؟"

"جب میں تمہاری طرف الائچی دانے پھینکنے لگتی، تو وہ جلتی تھی۔"

"کیوں"

"وہ چاہتی تھی، میں حق سے شادی کر لوں جو اس کا میرا ہے۔"

"تو حرج کیا تھا۔ وہ تو آج لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ ہمارے پہاڑ میں ہوٹل یمانی سے بہتر ہوٹل اور کوئی تو نہیں۔"

"جی! تو ایک نواب زادی ہوٹل والے سے بیاہ کرے، جو دو ھا جو

جو ہے۔"

" اور میں کون ہوں ؟"

" ہوٹل والا ؟ اور دودھاجو ! جاؤں آپ کے پاس سے ؟ تم تو گھر میں بھی رکھ رکھاؤ کا لباس پہنتے تھے۔ اتنی تھوڑی عمر میں دودھاجو بھی ہو گئے۔"

" ٹھہرو! ٹھہرو! نہ میں ہوٹل والا ہوں، نہ دودھاجو۔ میں تو ان چھپر اور اٹھپوتا ہوں۔ میری بہن کالج میں لیکچرار ہے۔ میں اس کے ساتھ یہاں آیا ہوا ہوں۔"

" تم نے اپنی بہن سے نوکری کرا رکھی ہے ؟"

" ابھی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ محبوب پھر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ میں نے اندر ہی سے پوچھا " کیا بات ہے ؟"

تو اس نے جواب دیا " کوئی پھر چوپر کھڑکی کھٹکھٹا رہا ہے "

" یہ سنتے ہی مہمان کے چہرے پر فاختہ اڑنے لگی۔"

اس نے کہا: " میں جاتی ہوں " اور بلا اجازت لیول ہی سنجاف لگی سمند چادر اوڑھ کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ دروازے تک میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ صحن میں کھڑے ہوئے دیدار ہوا میں سائیں جائیں کر رہے تھے۔ گوردوارے میں اس وقت کورس پر جنگی ترانہ جوش و خروش کے ساتھ گایا جا رہا تھا۔ جس کے آخری بول تھے " راج کرے گا خالصہ" سکھ یہ بول کو دکودکر ادا کر رہے تھے ....

اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس جانے والے حسین شہریار کے جسم و جان پر راج کرتا۔ خواہ وہ راج ایک رات کی سلطنت ہی کیوں نہ ہوتی۔ میں اس تھوڑے سے عرصہ میں خوب چام کے دام چلاتا۔

جب میں کمرے میں واپس آیا تو وہی گندمی لڑکی جھجکتی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔ میں آرام کرسی سے تکیہ لگائے بغیر ہی کھنچا کھنچا بیٹھا اور وہ اپنے بیضوی چہرے کی بادامی پتلیوں والی موتی چور رنگت کی آنکھوں سے میری طرف اس طرح سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "اسے تو دیکھا ہے۔ ذرا مجھے بھی دیکھئے۔ میٹھا تو کوئی چند مرتبہ ہی کھا سکتا ہے اور نمکین ہمیشہ۔ وہ فطیری ہے تو میں خمیری ہوں۔"

اس کا رنگ کھلا گندمی نہ تھا بلکہ وہ تو ملی ملی دھیلی دھیلی ابھرتی سی تھی۔ گندمی سے سانولا بن جانے میں صرف ایک ڈیڑھ سوت کا فرق ہوگا۔ یعنی یہ معلوم کرنے میں کہ کس کا پلڑا بھاری ہے ہیر پھیر کرتے رہنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں نے اسے ٹھہرنے کے لئے نہیں کہا کیونکہ پہلی سے میری محرومی کی ذمہ دار بھی یہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے خفا خفا سے تھے۔ نہ وہ بات کرتی تھی نہ میں۔ بس ایک دوسرے کو چپ چپ دیکھ رہے تھے۔ میں نے تو گویا اس سے نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔ جب آدھ گھنٹہ یوں ہی گزر گیا تو اس نے گویا تھکن سے ٹانگیں سی بدلتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔

"معشوق کہاں ہے؟ باغ و بہار۔"

"باغ و بہار کی باتیں مالی سے پوچھئے۔ اس کا کوارٹر وہ بید زاروں کے پاس

ہے ۔ آپ تشریف لے جا سکتی ہیں ۔"

"میں تو منی کو پوچھتی ہوں جو آپ کے الائچی دانہ مارا کرتی تھی ۔"

"کیوں کیا تم اس کی محافظ ہو ؟"

"وہ میری دوست ہے ۔ میں اسے سمجھا دوں گی کہ ادھر کبھی نہ آنا ۔ یہ بڑے نوابزادے کھرے اور درشت ہیں ۔ اپنے مہمانوں کو کھڑے پیر کا روزہ رکھوا دیتے ہیں ۔"

"لیکن ہاں ہوٹل والے کے پاس چلے جانا ۔"

"اتنی ذرا سی دیر میں وہ اتنی بے تکلف ہو گئی تھی کہ یہ تک بتا دیا ؟"

"نوابزادیوں کے لئے آپ کو بھی ایسے ہی ملکو تجربہ تلاش کرنے تھے ؟"

"وہ ملکو تجربہ ہیں ۔"

"نہیں آپ کے عزیز ۔"

اگر وہ میرے پاس ٹھہرتی تو میری چڑچڑاہٹ سننے اسے حبس النفس ہو جاتا ۔ جس طرح کوئی سہی گڑیا اپنے کانٹے کھڑے کر کے غصہ کا اظہار کرے ۔ وہ یوں سوجی پھولی گیا سامنہ بنائے ہوئے جانے لگی تو میں نے اس کا پلہ پکڑ لیا ۔ اور گدگدیاں اٹھا کر اسے اچھلانے کی کوشش کی ۔ لیکن میں اپنے ہاتھ اس کے پیٹ پر دو تین مرتبہ ہی پھیر سکا تھا کہ وہ پلا چھڑا کر بھاگ گئی ۔

میلے گندمی رنگ لڑکی کے جانے کے بعد مجھے نیند نہیں آ رہی تھی ۔

یہ خوف ہو رہا تھا کہ اس نے منیٰ سے میری غیر رسمی ملاقات کی بھنک
اس کے فوجی شا بھائیوں سے کر دی ہو گی اور وہ ابھی بندوقیں چھپائے
ادھر آ رہے ہوں گے ۔ میں بلا محبوب کو خبر کئے دروازہ کھول کر سڑک
پر نکل گیا ۔ گردوارے کی موسیقی مجھے اپنی طرف شمال میں بلا رہی تھی۔
لیکن میں مغرب میں درّہ ساویراں کی جانب گامزن ہو گیا ۔ جب میں
کوئی ادھ میل سے بھی زیادہ فاصلہ طے کر چکا تو گردوارے کی موسیقی
بند ہو گئی ۔ دیودار کا بہت گھنا سہناک جنگل سیاہ پڑا تھا جنگل شروع
ہو گیا اور میں نے پیچھے سے آہٹ سی سنی ۔ مڑ کر جو دیکھا تو منیٰ تھی ۔
ہیبت زدہ سی اور متوحش ۔ اس کی ہیئت سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے
سب راز افشا ہو چکا ہے ۔ اس نے بڑے بڑے چوکھونٹے بٹنوں والا
اوورکوٹ اور مردانی ٹوپی پہنی ہوئی تھی ۔ اس نے کہا : " یہاں تری دل آشفتہ
پر اب بھی پریم بوٹی ہوگی ۔ "

" نہیں ۔ "

" اس کی جڑیں تو ہوں گی ۔ "

" وہ تو اور بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہیں ۔ "

" میں تو پھر بھی منہ نہ بناؤں ۔ اور تم ؟ "

" میں کیوں بناتا ۔ "

" آؤ پھر وہیں چلیں ۔ "

" درّہ برف سے اٹا ہوا ہے ۔ "

یہاں سے ہم لوٹنے لگے۔ جب ہم ترنی کھونٹی پر پہنچے جہاں برطانوی
مشہدا ؑ کی یاد میں چھوٹی سی گرجا نما مخروطی لاٹ بنی تھی اور اس کے نچلے حصہ میں
چار طرف لمبی عمیق محرابوں والے دروازے تھے تو منی نے خود بخود اپنی باہیں
میرے گلے میں ڈال دیں۔

ترنی کھونٹی کے دونوں طرف دو آبشاروں نے شور مچا رکھا تھا۔ اور
سامنے وہی ٹیڑھا بیڑا پہاڑی نالہ دھائیں دھائیں کرتا ہوا جھلملا سا رہا تھا۔
جو ہماری جائے رہائش سے جنوب مغرب میں گزرتا ہے، اور جسے "دل داشتگاں"
کی پرکرما کا فخر حاصل تھا۔ یہیں سڑک سے ذرا ہٹ کر کھوہ میں سوکھا ہوا کرٹ اور
گھاس جمع تھی جنہیں ہم نے اٹھا لا کر ماچس دکھائی تو بھک بھک جلنے لگی۔ آگ
کی روشنی میں اس کی معشوقی اور ہی طرح کی نکلی۔ اس وقت اس کے چہرے کا
جگمگا یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ چندر بنسی ہو۔ پھر ہم نے دیکھا سامنے سے کوئی
گھوڑا دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ وہ ہمارے پاس سے اس طرح گزرا جیسے گھڑ
سوار کھونٹا اکھاڑنے کے لئے گزرے۔ ہم جلتی ہوئی آگ چھوڑ کر گھر کی طرف
چل دیئے اور سوار نے مشق اس وقت تک جاری رکھی جب تک گھوڑ دوڑ والا
ہم سے سو گز کے فاصلہ پر نہ رہ گیا۔ یہاں سے سوار نے ورگھال کی راہ لی
جو جنوب میں کانتی کھنڈ کے پاس نیچی نیچی دیواروں پر سپاٹ ٹین کے کھنڈرے
سے تھے۔

جب میں گھر لوٹا تو اکادشی کا چاند بدستور دھند میں آیا ہوا تھا۔ منی کے
کاٹیج کا مرغ باد نما جنوب کو منہ کئے کھڑا تھا۔ کیونکہ اب برفانی ہواؤں کے

ساتھ چل رہی تھی۔ میں خالی کمرہ میں پہنچا تو وہاں اب تک روشنی ہو رہی تھی۔
اور گرمالہ بھی کام کر رہا تھا۔ میں بستر میں لیٹ کر بہت دیر تک اس کی چوچلوں
بھری آنکھیں اور چہرہ تمتمائے بھرے ذرا دبیز سے ہونٹ یاد کرتا رہا لیکن اب میں پہاڑ پر
ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اگلی صبح دن نکلنے سے بھی گھنٹہ بھر پہلے، ٹھنڈے
ٹھنڈے اندھیرے میں میدانوں کے لئے روانہ ہو گیا۔

اپنے شہر میں پہنچ کر مجھے کئی ماہ تک مغنی کا چسکا لگا رہا لیکن طبیعت
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر گئی۔ دو سال بعد سردی کے موسم میں یہاں بھی ایک ہوٹل
پیمانی کھلا۔ میں نے اس کے اشتہار صبح کے اخبارات میں پڑھے۔ اب وہ
مجھے لوٹ کر یاد آئی اور رنگین سے جی اسٹنے لگا۔

میں اسی شب خوب دیر ہوتے ہوٹل پیمانی کے ریستوران میں گیا۔
وہاں اب تک خوب چہل پہل تھی کیونکہ سونے کے جڑے زیور کی طرح چمکتی
کاؤنٹر پر بل کاٹنے والی لڑکی مغنی نے اپنے حسنِ عالم تاب سے ایوان روشن
کیا ہوا تھا۔ اس نے مخطط قمیض پر سونے کے جو کھردرے بٹنوں اور گردا گرد بیس
والی زمردیں کمری پہنی ہوئی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بالوں پر چمکیلا زرجدی
دوپٹہ تھا۔

کیا یہ وہی نواب زادی تھی جس نے اس سخت ٹھنڈی رات کو مجھ
سے کہا تھا:۔

"جی! تو کیا ایک نواب زادی ہوٹل والے سے بیاہ کرے۔ تم نے
اپنی بہن سے نوکری کرا رکھی ہے" کیا اس نے واقعی مالک ہوٹل پیمانی سے

بیاہ کر لیا تھا۔ بیاہ کر لیتی تو کچھ عیب نہ تھا۔ وہ تو حج کی داشتہ تھی مجھے ایک بیرے نے ایسا ہی بتایا تھا۔ اس نے بھی کیسی دبیج پلٹ لی تھی۔

میں تقریباً تمام ہی وقت اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر بل کی ادائیگی کے لیئے خود ہی سونے کے نئے زیور کی طرح چمکتی دمکتی کاؤنٹر پر گیا۔ تاکہ اسے نزدیک سے دیکھ سکوں۔ وہ وہی تھی جس کا بدن اس ہاتھی دانت سے بھی اوّل تھا جو کبھی آئی وری کوسٹ کے تاجروں نے بہترین سمجھ کر دساور کو بھیجا ہوگا۔ مجھے اب بھی وہ ایسی ہی اڑاک دم باز کبوتری معلوم ہوتی۔ جسے صبح کو اڑائیں تو شام کو اترے اور سردیوں کی ٹھنڈی دوپہری میں دور آسمان پر کالے بادل تکے سفید تارا سا چمکے۔ اس کے جسم پر ایک رتی بھر گوشت زیادہ نہ تھا اور نہ کم تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسے فوراً ہی منتھیا کر اپنے باغ لب دریا کے تی منزلہ پرلے جاؤں جہاں وہ برساتی تھی جس پر قوس قزح رنگ کا نالی دار لہریا ٹین پڑا ہوا تھا۔ وہیں میں نے پچھلی سردوں کے چار جبڑے شوقیہ پالے ہوئے تھے۔ یہاں کھڑے ہو کر ہم دونوں ڈھلوانوں سے ہریائے ہوئے ربیع کے کھیت دیکھتے جن میں دیہاتی مویشیوں کے سے منہ ہرا چاٹتے پھرتے ہوئے ہوتے۔

اس نے میری طرف ذرا بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تو میں سمجھا یہ دل چوری نہیں، اتفاقیہ امر ہے لیکن جب ہفتہ سے زیادہ گزرا اور اس نے میری طرف آنکھ ہی نہ اٹھائی، تو میں سٹپٹا ہی تو گیا۔ ایک شب..... جب کافی چھیڑ ہو گئی تھی میں نے کاؤنٹر پہ جا کر اس سے پوچھا۔ "اب کے

لوہڑی کہاں منائیے گا ؟"

"ہم ہندو نہیں ۔"

"اس رات گوردوارے میں کیسی مسحور کن موسیقی ہو رہی تھی، راج کرے گا خالصہ ۔"

"ہم سکھ نہیں ۔"

"میں جانتا ہوں آپ ہندو ہیں نہ سکھ ۔ جو ہیں، ہیں ۔ میں تو آپ کو کچھ یاد دلانا چاہتا تھا ۔

ہمیں کچھ یاد نہیں آتا ۔

جب آپ نیاضی دکھانے کے لئے چور کھڑکی سے آئی تھیں، سنجاف لگی چادر میں پہاڑی کستوروں کے پر دل ایسا جبا اور دار جاگیہ اور شمیز پہنے ہوئے ۔"

"وہ کوئی ناخنتہ ہو گی، جو ارالیکی، ہم نہیں تھے جی !"

"اور وہ الائچی دانے !"

"آپ چاہتے ہیں یا تو ہم کاؤنٹر پر نہ ٹھہریں یا آپ ایسوں کا داخلہ اس ریستوران میں بند کر دیا جائے ۔ ایسی بے وزنی باتیں نہ کیجئے ۔"

"جاں ستانم، دل ستانم ۔"

"کیا تمہیں مجال رکھی ہے، خاموش !"

"ایسی ثقیل زباں نہیں بولا کرتے ۔ اور ہم سے الفاظ نہ کہیئے ۔ آپ اپنی مسرت نہ گنوائیں ۔ نہ ٹھنڈا بنیں، جائیں ۔"

"آپ بڑی چھچھوری اور منہ زور ہیں۔"

"اڑ پڑنا بکیں۔ جائیں، جائیں۔"

"اس طرح نہیں پھٹکارا کرتے۔"

اس کی آنکھیں نیلی پیلی ہو رہی تھیں۔ اس کے متمرد متکبر چہرے کا پھولاؤ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے میرا ذرا بھی پاس خاطر نہیں۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں زور سے پھٹپھٹائیں، بند کیں اور کھول دیں۔ وہ گویا مجھ سے برسرِ پیکار ہوا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تو گویا اگیا بیتال کی آنکھوں ایسے چمکے جلنے لگے تھے۔

جب میں باغ لبِ دریا پہنچا اور لباسِ شب پہن کر لیٹنے میں لیٹا ہی تھا کہ محبوب نے خبر دی "کوئی لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔ ڈرائنگ روم کے برآمدے میں کھڑی ہے۔"

"تم نے نام پوچھا؟ .... کون ہے؟"

"وہی جو پہاڑ پر چور کھڑکی سے آئی تھی۔"

میرا جی سن سے ہو گیا کیونکہ میں نے خیال کیا کہ یہ عنی ہو گی جسے پھر ویسا ہی انبساط ہوا۔ وہ جو ریستوران میں سخت رعا در برسرِ پیکار سی نظر آتی تھی وہ محض ھیکڑی دکھا تا تھا۔ پہاڑ پر بھی جوڑ ملانے اور موزوں ہونے کے لئے آئی تھی۔ سو یہاں بھی آ گئی، اس کی درست نیتی میں کوئی شک نہیں۔ میں نے محبوب سے کہا کہ اس کے لئے ڈرائنگ روم کھول دے تاکہ اتنے میں کپڑے پہن کر تیار ہو سکوں، پھر سوچا کر

کر اس تکلیف کی بھی کیا ضرورت ہے تو وہ یہیں آجائے گی۔ پھر میں نے اپنی خواب گاہ میں بجائے مغنی کے اسی گندمی سانولی لڑکی کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ آتے ہی بولی: "آج بھی ناخواندہ مہمان کو کھڑا رکھ کر اس کی تواضع کھری کھری باتوں سے کیجئے گا۔"

"کہیے تو آپ کے لئے اپنی آنکھیں بچھا دوں۔"

"آپ نے میرے بشرے سے قیافہ شناسی کر لی ہے۔ دیکھئے کہیں گرما گرم خبر سے تلملا نہ جائیے گا طبیعت صلواتیں مار رہی ہو گی۔ وہ موٹر لئے پل پر کھڑی ہے، آپ کے انتظار میں.... آپ کو منانے کے لئے آئی ہے۔ اخلاص مندی کے نظارے کبھی نہ دیکھے ہوں تو آج دیکھ لیجئے گا۔ یہ کمرہ کافی بڑا ہے نیچے پھول دار جامنی قالین بچھا ہوا ہے۔ وہ اسی میں اپنا "ٹریفک کے سپاہی والا ناچ" دکھائے گی۔ وہ تلوار کا ناچ بھی جانتی ہے۔ ڈول سے پانی بھرنے کا ناچ بھی۔ وہ بہت اچھی رقاصہ ہے۔ لیکن ٹریفک کے سپاہی والے ناچ سے وہ ایسے تیر بے طرح مارتی ہے کہ دیکھنے والے سب بے کل ہو جاتے ہیں۔"

میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، دل چاہ رہا تھا کہ بھاگا بھاگ اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ ہم کھلی چاندنی میں ان وادیوں کے پاس سے گزرے جو روش کے دونوں طرف ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے جاپان کے جھنڈے میں سورج۔ جب ہم پل پر پہنچے تو مغنی نے جو موٹر کی پچھلی گدی پر بیٹھی ہوئی تھی کھڑکی کھول دی۔ گندمی رنگ لڑکی اندر گئی ہی تھی کہ موٹر چل پڑی۔ میں

اسے اچھی طرح سے دیکھ بھی نہ سکا تھا ۔ لوٹتے ہوئے جب میں گلِ شبّو کے
پاس سے گذرتا ہوا وادیوں میں پہنچا تو میں نے دو تین گملے ٹھوکر مار کر توڑ دیئے ۔
میں سوچ رہا تھا کہ اسے کبھی بھی نہ کُبلا نہ لگا اور وہ یہاں اس طرح لائی جائے
تو عجب بات ہے ۔ جس طرح میرے دوست عبدالملک کے گاؤں
میں جٹیئے چمار گھینٹا چڑھانے کے لئے سؤر کو لاتے تھے ۔ اس کی چاروں
ٹانگیں مضبوط جیوڑی سے جکڑی ہوئی ہوتی تھیں ۔ وہ بلی میں سر کے بل لٹکا
ہوا ہوتا ، جسے یہی چمار کندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے ۔ عبدالملک کے
باپ کا اس گاؤں میں وہ زور تھا کہ کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ سور کو پاؤں
پاؤں چلاتا ہوا لا سکے ۔

اگلے دن میں شہر کی سب سے بارونق شاہراہ سے گزر رہا تھا
جب میری کار ریجنٹ چوک کو عبور کرنے لگی ، تو سامنے سے میری طرف
آتے ہوئے مغنی نے ایسی چیخ سی ماری جیسے وہ حادثہ کا شکار ہوئی جا رہی ہو ۔
میں نے رک کر کہا " خیریت تو ہے ؟ " وہ منہ سکوڑا کر یہ کہتے ہوئے بڑھتی
چلی گئی ۔ " آپ بڑے بے تکے ڈرائیور ہیں ۔ آپ کا چالان ہونا چاہیے ۔
اور بھاری جرمانہ ۔ "

میں نے اسے کلائی سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے جواب دیا ۔ " جو
آپ جھوٹی گواہی دیں گے تو ضرور میرا چالان ہو جائے گا ۔ "

" نہیں جی ۔ "

" تو پھر کچھ نہ ہو گا ۔ "

"وہ جو کچھ میں نے آپ سے کاؤنٹر پر دو دو لڑکیں کی تھیں اور ذرا دل کا غبار نکالا تھا اس سے ناراض ہیں آپ ؟"

"اس سے مجھے یہ پتہ چلا کہ آپ انڈیا مین کا پھل ہیں دیکھنے میں خوب مگر بدذائقہ .... باہر سے بھلی ... اندر سے ظالم۔"

"خوش ذائقہ اور تعریف والا، آپ بڑے طماع، حریص، اور راو چنگ باز ہیں۔"

"ثبوت ....؟"

اس رات جو ہم آپ کے پاس آئے تو آپ کی عملگی دیکھ لی تھی۔ آپ ہمیں فرو کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ آپ ہمارے مقابلہ پہ تیار تھے، ہمیں بات کی بات میں ہڑپ ہی تو کر لیا جاتا۔ لیکن آپ بڑے ریائی، بڑے تھڑدے، نارو اور بدسرشت نکلے تھے۔ جو آپ کو ہماری ہوس ہوتی تو ہمیں آپ اپنے حال پہ چھوڑ کے یوں دم دبا کے سر پہ پاؤں رکھ کر نہ بھاگتے۔ ...... اور اتنے عرصہ کی فراموش کاری کے کیا معنی ہیں؟ تو پھر اس صورت میں ہم نے مسٹر جی سے بنائی تو کوئی الاہنا تو نہیں دے سکتا۔ البتہ ہم فی الواقعہ آپ کو دوکھ سکتے ہیں۔ آپ کا دفتر پہاڑ پہ ہی رکھا رہ گیا تھا۔ جو ہم اس کے ممبر سے سے نہ بناتے تو وہی جو ہمارے بعد آپ کے پاس آئی تھی کہتی تھی کہ ہنڈا چھوڑ کر ہمیں سر بازار رسوا کرائے گی۔ ہمیں آپ کی شتر دلی، سبک مزاجی، ہلکائی اور ہیٹے پن پہ اتنا غصہ آیا تھا کہ آپ کو کوہ آتش فشاں پہ بٹھا دیتے، جس سے آپ کا سلفہ ہی تو ہو جاتا۔

اسی برتے پر آپ تجدید ملاقات کے خواہاں ہیں۔ ہم نے آپ کو اپنا دل نکال کر دیا تھا۔ جس کی آپ نے یہ قدر دانی کی تھی کہ اسے گھور پر پھینک مارا تھا۔ جب ہم آپ کے قابل تھے، آپ ہمارے قابل تھے۔ اب نہ ہم آپ کے قابل ہیں، نہ آپ ہمارے قابل۔"

اس وقت میرا دل یوں چاہا کہ اسے فوراً ذگمگا جاؤں لیکن وہ رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟" اس نے ایک سسکی بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "کلائی میں درد ہو رہا ہے، چوڑیاں چبھ گئیں۔ اور کچھ کالی چوڑیوں کے ٹکڑے سڑک پر پڑے تھے۔ پھر وہ کہنے لگی۔"

وہ گھوڑ سوار جو اس شب ہمارے نیزہ سا مارتا پھرتا تھا۔ حبشی تھا۔ اسے ہم پر مسلط کرنے والی وہی گیہواں رنگ گھاتن تھی۔

رات کو میں پھر ہوٹل یمانی کے رستوران میں گیا۔ کاؤنٹر مغنی سے خالی تھا۔ میں نے بیرے سے دریافت کیا تو اس نے کہا "مانگ آیا ہوا ہے، آج وہ اس کے پاس ہے۔ جو ہوٹل یا رستوران حبشی صاحب کھولتے ہیں یہ لڑکی وہاں ضرور بھیجی جاتی ہے۔ اور جب کام چل نکلتا ہے۔ تو اسے مالک اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ حبشی صاحب کے جتنے ہوٹل ہیں باری باری ان سب میں ہی کبھی نہ کبھی یہ اس طور سے جاتی رہتی ہے۔ حبشی صاحب کے بہت ہی اعتبار اور پیار کی چیز ہے۔ لیکن ان سے شادی نہیں کرتی۔ اس کے باپ نے بھی اس کی ماں سے نکاح

نہیں پڑھایا تھا۔ مغنی کی ممی نواب کی محل اسے لونڈی کی طرح سے رکھنا چاہتی تھی لیکن باپ نے اسے خوب لکھا پڑھا دیا۔ اس کے کامان بیگم صاحبہ مالک سے لڑ کر میکے چلی گئی ہیں۔

"پوچھ سکتا ہوں۔" "ان کے ماں باپ کون ہیں؟"

"باپ نواب تھا، عرصہ ہوا مر گیا۔ ماں لونڈی تھی جسے بچے اٹھانے والے فقیروں نے نواب کے باپ کے ہاتھ لا کر بیچ دی تھی۔"

جب میں رستوران سے باہر نکلنے لگا تو دروازہ کے شمال میں سیڑھیاں اوپر جاتی تھی جہاں لکھا تھا، "پرائیویٹ رہائش مالک۔" اس طرف سے مجھے چھن چھن، گن گن کی آواز آئی، تو میں اوپر چڑھ گیا۔ سامنے طرب گاہ کا دروازہ بند تھا۔ میرے پیچھے پیچھے چائے آ رہی تھی جسے وہی بیرا لا رہا تھا جسے میں نے کافی بخشش دے کر باتیں پوچھی تھیں۔ میں نے اس سے کہا "اندر ناچ ہو رہا ہے۔" "کون ناچ رہی ہے؟" کاؤنٹر والی، تھوڑی دیر کے لئے دروازہ اس طرح سے کھول جانا کہ ہم بھی جلسہ دیکھ سکیں...

...... یہ اور بخشش لیتے جاؤ۔"

مغنی ٹریفک کے سپاہی والے ناچ میں مشغول تھی۔ ہٹلر ایسی مونچھوں والا حبشی سماجی کی طرح صوفے پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس کے رقص سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ وہ مجھے ڈھینگا سی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے وہی پہاڑ والی ریشمی شمیز اور زنگار نما جانگیہ پہنا ہوا تھا۔ بدن کا ہاتھی دانت اب بھی کھرا تھا۔ لیکن وہ جلیل القدر نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا غصہ آ رہا تھا جیسے دوڑ کر اس کے تر سواس چھوڑ دوں گا۔ اور ہاتھ پاؤں پر سرخی سے جو رنگ چلاؤں گا

ٹریفک کے سپاہی کا ناچ ختم کر کے اس نے جپسی ناچ شروع کیا۔
حتی سماجی کی طرح سمہ سرخ دف بجاتا ہوا انگریزی کا یہ فلمی گیت گا رہا
تھا :-

"Dance, Little GYPSY
And so we are your spell.

خانہ بدوش لڑکی تو ناچ ناچ، ناچ
جادو کے تانے بانے تو خوب بنتی ہیر"

جب میں یمانی سے سڑک پر آیا تو عنابی ساڑھی پر بنفشی اوور کوٹ
پہنے ہوئے وہی گندمی سی لڑکی مل گئی، وہ میرے ہاں پرائیویٹ کمرہ میں دو
مرتبہ رات کو غیر وقت آ چکی تھی جس سے کچھ تکلف کم ہو گیا تھا... اس سے
میں نے کہا "گمان غالب یہ ہے کہ جب میں نے پوچھا تو آپ اپنا نام مخفی نہ
رکھ سکیں گی" اس نے اپنے ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی کرن کے ساتھ جواب
دیا "ثمرا"

"آپ میرے ساتھ کہاں چل سکتی ہیں؟"

"جہاں آپ لے جانا چاہئیں۔ کیا اس دوزگی اور دغیلی سے کھٹا ہی
ہو گئی، جس کے مئے درہم برہم ہوئے پھرتے تھے۔"

"باندی بچہ، حسن کی سرچڑھی داشتہ۔ عیار..... مکار!"

"جس کی روائے عصمت پر ایسے کھرونٹ آئے ہوئے ہیں کہ کئی
جگہ سے پھٹ بھی گئی ہے؟"

"کئی جگہ سے نہیں پھٹی، جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔"

"آپ، اس ردائے عصمت کو مزید پھاڑنا چاہتے تھے۔ اور بند قرم کھلتے تو اس کے آگے سے کامدانی گر پڑتی اور تنگ تنگ کر دمکتا جھکولے کھاتا ہوا شباب دکھائی دے جاتا۔ اس کا گودا تو کسی اور کے کام آیا۔ وہ آپ کو چھلکا دینا چاہتی تھی۔ لیکن آپ اسے ہی بے غل و غش قبول کرنے کو تیار معلوم ہوتے تھے۔ اس نے تو اپنے اوپر اتنا بڑا فضیلت کا پگڑ بند ھوایا ہوا تھا کہ ناک اور دھانہ تک ڈھک گئے تھے۔"

"اس رات وہ گھڑ سوار آپ نے ہی بھیجا تھا.... کیوں؟"

"میں نے نہیں بھیجا تھا۔ میرے جذبِ رقابت نے بھیجا تھا۔ کیونکہ پہلے تو وہ آپ کی شمشیر زنی کے کرتب دیکھنے کے لئے آپ کے پاس پہنچی۔ تو اس کا تو میں نے کھنڈن کر دیا تھا۔ لیکن اسے ڈنگ کھانے اور ٹیسیں لگوانے کی اتنی پڑی ہوئی تھی کہ اس نے باہر نکل کر آپ کا پیچھا کیا اور حبشی صاحب جو اس کے لئے اپنے دل و جگر دونوں ہاتھوں پر لئے پھرتے تھے میں نے انہیں جا بتایا۔"

"جو میں اگلے دن ٹھہر رہتا تو کیا ہوتا؟"

"مغنی کے مقبرے اور کھٹی دن دوپہر میں آپ کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو خاص حبشی پہریداروں نے برطانوی سپاہیوں سے کیا تھا۔"

میرے دل کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کوئی اس پر ریگ مال چلا رہا ہو۔ کچھ تسلی سی محسوس ہوتی تھی تو صرف اس سے کہ میرا

کاریں ارادتاً مجھ سے مل بیٹھی تھی ۔ میں مغنی کے سر نشان کو اپنی یاد سے
اس طرح ختم کرنا چاہتا تھا، جس طرح "بندہ بہادر" کے نشانات
پنجاب کے گورنر نے ختم کئے تھے ۔ اُس کی بلی تک قتل گاہِ سرہند میں
اس کے سامنے ہی مار ڈالی گئی تھی ۔ میں مشرق کی طرف شہر سے باہر
ویرانے میں نکل گیا، جہاں سڑک کے دو طرف ریت کے چھوٹے چھوٹے
ٹبے سے تھے ۔ ان پر کہیں کہیں کالی خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور کوئی
کوئی گیدڑ سڑک کی طرف منہ اٹھائے ہوئے اس طرح بول رہا تھا جیسے
کسی گاؤں کے بڑے مردود کتے ژولیدہ حال راہی کو دیکھ کر بھونکیں ۔ کسی کسی
جگہ کوئی اگیا بیتال پھر رہا تھا ۔ جس کے منہ میں بڑی لو کے چراغ جل رہے
تھے ۔ شمال میں سڑک کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک دریا بُرد اراضی
میں کھاد کے لئے بوئی ہوئی سنی کی طرح سے بھانگ کھڑی ہوئی تھی ۔ دریا
کا ریت چاندنی میں چمک رہا تھا اور پانی کی ایک جنگل سی سیا لکیر کھنچی ہوئی
تھی ۔ اسی دریا کے کنارے سے قد آدم ولایتی دھتورا بھی کھلا ہوا تھا ۔ اور
قد قبیل جنڈ پودوں پر بے لبے بھورے بھورے ڈھول ایسے پھول لٹکے
ہوئے تھے ۔ جب ہم تیس میل دور جھانگڑ جیسے پیکڑوں کے نزدیک پہنچے
تو مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے ان پر رائفل والے دشمن چھپائے ہوئے
ہیں ۔ اور جب ہم ادھر گئے تو ضرور گولیوں کی بوچھاڑ ہو جائے گی جھانگڑیں
لکڑ بھگے چلا رہے تھے ۔ میرے دل میں اس وقت ایسی ہول بیٹھی کہ
یہیں سے شہر لوٹ پڑا ۔ مغرب سے دل بادل بھی چلا آ رہا تھا ۔

جب میں اور سمرا ہل پر آئے تو کار کی چھت دھواں دار گھٹا کی بوندوں میں پٹاپٹ بول رہی تھی لیکن جب ہم گیراج سے اتر کر خواب گاہ کی طرف جانے لگے تو ایسی بھوار پڑنے لگی کہ کپڑے تو نہ بھیگیں لیکن سیل ضرور چڑھ جائے۔ خواب گاہ میں پہنچ کر میں نے لباس شب خوابی پہن لیا اور سمرا کو بھی ایسے ہی گلناری بینگنی دھاریوں والے کپڑے پہنا دیئے جو اس پر خوب سنگر گئے۔ آج شام سے نہ سمرا نے کچھ کھایا تھا نہ میں نے۔ اس نے مجھے اپنی طرف سے بیٹھ کر کے لٹایا اور وہ میری پشت سے بھی ہو کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی: "سمر..... خالی پیٹ نہیں سویا کرتے" اس وقت خانساماں سو چکا تھا۔ سمرا میرے ساتھ باورچی خانہ گئی۔ اس نے برقی اسٹو پر انڈوں کا زعفرانی خاگینہ، ہلکے میٹھے پراٹھے اور چائے تیار کر لی۔ بانسی کے پرانے چاول پہلے سے پکے ہوئے تھے، ان پر ڈھیر سی سیوا ری جما کہ گھی کھوپرا کشمش بادام ڈالے۔

جب ہم دانت صاف کر کے بستر میں بیٹے تو میرے تردوات کافی دور ہو چکے تھے۔ میں نے اسے اس طرح سے ترچھایا کہ اس کی ٹانگیں پٹی سے نیچے لٹک گئیں پہلے تو میں نے اس کے کندھے پکڑ کر ٹٹولتا رہا لیکن جب اس کے سنسناتے ہونٹ تمام میرے اختیار میں تھے اور میں شائد اُچھو ہی ہو جاتا تو دروازہ پر سہمناک دستک ہوئی۔ ملازم ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی بادل گرجنے لگا۔ یہ گھور ایسی بھیانک معلوم

ہو رہی تھی جیسے کوئی مردم خور دیو نحیف و نزار انسانوں کو منہ منہ کر کے جا نگ رہا ہو۔ میرا منہ کا منہ میں ہاتھ کا ہاتھ میں رہ گیا۔ سمر نے کپڑے پہن لیے۔ اور وہ پچھلی کھڑکی سے اس پیڑ کی طرف اتر گئی، جس کا تنا اور پتے راجپوت مدرسۂ مصوری کے درختوں ایسے گنجان تھے۔ اس کی شاخوں پر میں کلغی دار، تاج دار، دراز دم، رنگ دار پرند بیٹھا کر دیکھا کرتا تھا۔ اس پر برسات میں رنگ برنگ پھولوں کی بیلیں بھی چڑھا کرتی تھیں۔

دروازہ کھلتے ہی ہٹلر ایسی مونچھوں والا جیٹی اندر داخل ہوا اور واقعی جیسے میرے دوست عبدالمالک کے گاؤں میں جھٹکے چمار گھیٹا چڑھانے کے لیے سور کو بانہی میں ٹانگوں کے بل لٹکاتے ہوئے لایا کرتے تھے کہ اس نجس جانور کے پیر گاؤں کی زمین پر نہ پڑیں یعنی اسی طرح سے یہاں لائی گئی تھی۔ جیٹی نے باندی باندں کی طرح بولتے ہوئے کہا "سردی خوب ہو رہی ہے۔ میں آپ کو گرم رکھنے کے لیے ایک چیز لے آیا ہوں۔ ٹریفک کے سپاہی والے ناچ کے بعد جو آپ نے بھی دیکھا تھا راز دار بیرے نے ان کا یہ آپ کے نام محبت نامہ آپ تک پہنچانے کی بجائے مجھے پہنچا دیا۔ اس میں انہوں نے آپ سے اپنے ناز بے جا کی معافی مانگی ہے۔ پرسوں یہ آپ کے پاس آتے آتے پل پر سے لوٹ گئیں تھیں اور انہیں گوردوارہ کا نوحی گانا بھی یاد آ رہا تھا۔ جب یہ جامنی تامین والے کمرے میں آپ کے پاس لوہڑی کے تہوار والی رات کو گئی تھیں۔ کسی کی ابتدائے عشق کسی طرح ہوتی ہے کسی کی کسی طرح۔ آپ کی الائچی دانوں سے ہوئی تھی۔

ہیں اپنی بیاہتا کو طلاق دے چکا۔ اگلے ہفتہ یہ چوہر محل میری منکوحہ بننے والی تھیں۔ ان کے پاس روپیہ کی کمی نہیں گو نواب صاحب اپنی زندگی میں اپنی کل جائیداد اپنی اجنبی اولاد کے نام منتقل کر گئے تھے۔ ان کی کنیز ماں کو نواب صاحب کے مرنے پر تیس ہزار ملا تھا۔ وہ مع اس رقم کے میاں بنس چھوڑ کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔ کنیز کی بٹوٹی کے نام میں نے تیس ہزار روپے بینک میں جمع کر دیئے ہیں۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لیکن آپ کے ساتھ یہ خوب نبھائے گی۔ آپ سے انہیں عشق ہے۔ ہم سے تو اب تک اکھڑ الٹ پلٹ ناطہ تھا۔ یہ نہیں جب ان کے پاس ایک مارتول تھا، تو پھر دوسرے مارتول کی ضرورت کیوں پڑی؟ دیکھیئے انہوں نے خط میں آپ کو القاب کیا لکھا ہے "غفران پناہ!"

حسنی چکّی سی بھوبھر کر چلا گیا۔ کنیز کی بٹوٹی مغنی نے ٹریفک کے سپاہی والا ناچ شروع کر دیا۔ وہ خوشی میں گا رہی تھی۔

"Dance Little gypsy
And so Weave your spell"

میں نے اس سے کہا "چپ چپ۔ سب جاگ جائیں گے بھگدڑ مچ جائے گا۔" وہ چپ تو ہوئی لیکن ناچ بند نہ کیا۔ کچھ دیر بعد قالین پر

بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ "آپ میرا جانا چاہتے ہیں تو میں ابھی چلی جاؤں؟"
"جس کی کسی کے دل میں اتنی چہچہاہٹ ہو، وہ اسے جانے نہیں دیا کرتا۔"
"تو پھر میں بھی آپ کی حلقہ بگوشی اختیار کر چکی۔"
"مجھے تم سے اپنی چاک جگری کی رفوگری کرانی ہے۔ تم چلی گئیں تو اس کا قرحہ بن جائے گا۔"

اس پر وہ ان چار چشموں کی طرح کھلکھلا اٹھی جو "دل عاشقاں" پر چھایا کرتے تھے اُس کی آنکھوں میں نشہ آ گیا تھا، اور چہرہ کی جگمگاہٹ بڑھ گئی تھی۔ پھر وہ مجھ پر جی جان سے قربان ہوتے ہوئے بولی: "مجھ پر تو آپ صاجی کریں۔ میں تو ہمیشہ آپ کی حاضری میں کھڑی رہا کروں گی۔ منی کی ماں کو بچے اٹھانے والے فقیروں نے نواب کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ منی آپ کی بے درہم لونڈی بنی رہے گی، نہیں بلکہ عبادتی۔"

پھر میں اس کی صبیح البدنی کو دیکھنے لگا۔ "دل عاشقاں" والی سنگ پر کھڑے ہوئے دیو دار اس سے زیادہ طراوت بخش اور سیدھے سڈول نہ ہوں گے۔ اس کا بشرہ نہایت ہی مخلصانہ اور سلیس تھا۔ وہ ستودہ صفات اور سلیم الطبع معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت آسمان پر ساون کے مہینہ ایسی ہبڑ دبڑ مچ رہی تھی۔ جب گولا دھار برسنے لگا تو سمرا کھڑکی کھول کر اندر آ گئی جو الائچی دانے والی کو مظفر و منصور دیکھ کر روپوش اور سوئٹ ماری سی ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے بالکل شرابور ہو چکے تھے۔ میں اس

کے لیے سرخ و سپید دھاریوں والا اپنا لباس شب خوابی لایا تو مغنی میری طرف مفسدانہ سی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو" اور مجھے بھی تو۔" اسے میں نے سیاہ سپید دھاریوں والے کپڑے پہنا دیئے۔ اب یہ دونوں لڑکیاں برابر کی ہمسر تو نہ تھیں لیکن چندے آفتاب چندے ماہتاب یا شولے کے چھوٹے بڑے گنبد ضرور تھیں۔ اور دل چاہتا تھا کہ ان دونوں کے ہی لب و رخسار کو بوسوں سے چھپ دوں۔ میں نے مغنی اور سمرا کو اپنی خواب گاہ میں ایک بستر سونے کے لیے دیا۔ میری چارپائی ان کے پاس تھی۔ ہم تینوں ساری رات جاگتے رہے۔ دھوپ دانی میں خوشبوئیں جلتی رہیں اور باہمی ارتباط صرف لطیفہ گوئی تک محدود رہا۔ مغنی اپنا چہرہ اور کروٹ میری طرف کئے ہوئے لیٹی تھی۔ سمرا کو اس نے اپنے پیچھے لٹا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ جب ہنسی ہنسی میں سمرا مغنی سے بچھڑ ہو گئی، تو میرا دل بھی للچا اٹھا اور طبیعت چاہنے لگی کہ میں اپنا سینہ اس کے سینے پر ٹیپ دوں۔ ہم تمام رات منہ ایک دوسرے کی طرف کئے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ صبح ہونے سے گھنٹہ بھر قبل جب پھوٹیاں پھوٹنے لگا اور سمرا جھپکی لینے لگی تو مغنی نے کہا: "میں نے آپ سے ناامید ہو کر حیٰ سے تعلقات بڑھائے تھے۔ لیکن میں آپ ہی کی طرح سے اچھوتی اور ان چھیڑ ہوں، مجھ پر کوئی حاوی نہیں ہو سکا۔ میں ہر کسی کی دست برد سے بچی ہوئی ہوں، اور اچھوتی! وہ جو الائچی دانے میں ایک کالا کالا چھوٹا سا بیج ہوا کرتا ہے وہ مجھ میں آپ

کے لئے اب تک موجود ہے۔

"آپ ہیں تو وہ الائچی دانے کے اندر ایسا کالا کالا چھوٹا سا بیج فی الواقع صحیح وسالم موجود ہے لیکن میں کیا کروں، میرا دفتر تو پہاڑ پر ہی رکھا رہ گیا تھا۔"

یہ فقرہ سن کر اس کی سوئی کی نوک ایسی باریک باریک باچھیں تھوڑی سی کھنچیں اور برابر ہو گئیں۔ اسے اپنا وہ فقرہ یاد آ گیا ہو گا" البتہ ہم فی الواقعہ آپ کو دو کھ سکتے ہیں۔ آپ کا دفتر پہاڑ پر رکھا رہ گیا تھا" اور میں سوچنے لگا کہ خلیفہ مامون کی ماں بھی تو کنیز تھی اور میں نے لارڈس ہیلن کو یونان واپس لے گیا تھا۔ گو اس نے ہیرس کے ساتھ اتنے سال گزارے تھے۔ بھئی کو مجھ سے چسبیدگی ہے مجھے منفی ہے۔ ہم دونوں کا دور دور رہنا ایسا ہے جیسے لیے خوشبو آ رہی ہو اور کوئی ناک بند کرے۔

(سویرا لاہور)

ادھ کھایا امرود

۱

کوئی دوسرے کے ادھ کھائے امرود کو کیوں کھانے لگا۔ جب لنکا کا کوٹ ایک مرتبہ سر ہو چکا اس کے جید پھاٹک کھل ٹوٹ چکے، تو اس پر یورشیں کرنے میں کیا تک تھی، اور حسن جہاں افروز میلو کو اس کمتری کا احساس تھا۔ سو یہی وجہ تو تھی کہ ہم حدیقہ والی کوٹھی کے شرقی برآمدے کی طرف شام کی چائے پر بیٹھے تو وہ کہ جس کی نظریں کبھی نچلی نہ ہوا کرتی تھیں۔ جب وہ سامنے بیٹھی ہوا کرتی تو ایسا محسوس ہوا کرتا تھا جیسے اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کھلونے ہوں۔ اس کی آنکھیں گویا اڑتی تتلی کے پروں کی طرح رنگ پر رنگ پیش کرتی رہتی تھیں، لیکن آج اس کی آنکھوں میں نچلا پن تھا۔ اور حزیں سنجیدگی۔ ایک مرتبہ چائے پیتے ہوئے میرے منہ سے فسا سپر سپر کی آواز نکل گئی تو وہ مجھے جھپکانے کے لئے ذرا زور سے سپر سپر کرکے چائے پینے لگا۔۔۔ لیکن وہ تو ایسی خاموش رہی، جیسے مائیوں بیٹھی ہو۔۔۔۔۔۔ وہ اخبار نویس اور پارلیمانی سیکرٹری سے بھی زیادہ حاضر جواب تھی۔۔۔۔ مگر آج تو کھسیانیت سے اس کا منہ سیا ہوا تھا۔

باہر بجلی چمک رہی تھی - بادل ایسا گھٹا ہوا تھا جیسے برسنے پر پانی نیزوں چڑھ جائیگا - کوٹھی کے جنوبی حصّے میں جو لوکاٹوں کی منکڑی تھی - اس کے اندھیروں میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں بول رہی تھی - شرقی برآمدے کے آگے کھڑے ثمر آور جھمکدا سبزہ دے آم ہریالے ماحول میں سنجل معلوم ہو رہے تھے - مینو کا چہرہ بھی انہیں آموں ایسا تھا - پچھلے سال انہیں دنوں جب تھوڑا سا برسنے کے بعد دکھنا بادلوں کو بہتر بستر کر رہی تھی تو انہیں آموں کے درمیان میں نے اس عشوہ گر سے سوال کیا تھا -

"آپ کو گندھرپ کے معنی آتے ہیں ؟"

"نہیں"

"اس کا مطلب ہے - عشقیہ شادی، کیا آپ کو یہ پسند ہے ؟"

"...... پہلے پیار اور بعد کو شادی ؟"

"نہیں..... ہونا اس طرح چاہیئے کہ پہلے شادی اور بعد میں پیار -"

"اچھا مینو تو اگر یوں ہو جائے..... پہلے پیار بعد میں شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار ...... ہوں..........

...... اصل مقصد وصل دوامی ہو ؟"

"چند سے خاموش رہیئے ہمیں آپ کی باتیں پسند نہیں، ہم آپ کے پاس سے ابھی ابھی جایا چاہتے ہیں، پھر یہ اڑنگ بڑنگ باتیں فضاؤں کو سناتے رہیئے گا -"

"مجھے مضطرب چھوڑ کر نہ جایئے ...... نہ جایئے !"

"فراہم بتاتے ہیں کہ آپ دماغی توازن کھو چکے سراسیمگی بڑھتی جارہی ہے۔ اس لئے قیام مباح نہیں۔"

"آپ جیسی شستہ اور کتابی زبان کوئی نہیں بول سکتا۔"

"ہمیں مرزا غالب نے بھی یہی کہلا کر بھیجا تھا۔"

"دل چاہتا ہے کہ آپ کی باتیں ہی سُنتے جائیے۔"

"لیکن ہمارا آپ کی جانب میلان طبیعت ہی نہیں"

"آپ سلام ناز کر کے تشریف لے جا سکتی ہیں۔"

"ہمیں یہ بھی گوارہ نہیں۔"

"کچھ گوارہ بھی ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیوں کیا خطا کیا قصور!"

"نہ خطا نہ قصور، یہ ہمارا اقتضائے طبیعت ہے۔"

"جب سے تم منکر ہوئیں... دل ڈھا جا رہا ہے۔"

"دھڑام سے گرنے کی آواز تو ہمیں بھی آئی تھی۔"

"بدلی کی چھاؤں میں پھوار پڑتی ہوتی اور ہم دونوں تیسری منزلہ کی بارہ دری میں بیٹھے ساون کے تیز دن چڑھے ندی نالوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے۔"

"آپ کے سفلی احساسات آپ کو مبارک۔"

"آپ کو برشگالی رات میں جھینگر بولتے ہوئے کیسے لگتے ہیں۔"

"جیسے بھی لگتے ہیں،....... آپ ہرزہ سرائی جاری رکھئے، ہم چلے۔"

مینو میری عزیزہ تھی، بدر بھی عزیز تھا۔ ان دونوں کی رسم منگنی تو نہ ہوئی لیکن ویسے ہر طور سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔ بدر کو مجھ پہ اس لئے ترجیح دی گئی کہ اسے فوج میں کمیشن مل گیا تھا جب مجھے انتخابی بورڈ والے اس لئے نہ لیتے تھے کہ مجھ میں کچھ کچھ امردپنے کا شائبہ تھا۔ صدر بورڈ نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ اس سے تو پانچ میل کی دوڑ بھی نہ دوڑی جائے گی۔ میرے متعلق ان کا اندازہ قطعی غلط تھا شکار میں بدر نے مجھ سے زیادہ جفاکشی کبھی نہ دکھائی تھی۔ بلند ستانی جنگلوں میں میں نے جیٹھ کے روزے رکھتے ہوئے شکار کھیلا تھا۔ اور بدر نے پیاس اتنی محسوس کی تھی کہ اس نے اکثر تیسرے پہر سے پہلے ہی روزے توڑ دیئے تھے۔

یہ ابھی کچھ مہینے کی بات تھی۔ بقر عید کا مہینہ تھا۔ محرم سے لگتے چاند میں بدر اور مینو کی شادی ہو جانے والی تھی کہ میں اپنے ایک اور عزیز اور بے تکلف دوست جمالی کے ساتھ کوٹلہ شاہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ حجاب پائین کے جذبہ خودکشی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ باہر گرد اڑانے والا اندھیاد چل رہا تھا۔ فضا ایسی ہو رہی تھی جیسے شیطان اس میں قدیم رومانے زمانے کی رتھیں گھڑ دوڑا رہے ہوں۔ ہم تیسری منزل پر تھے، میری طبیعت اتنی چلبلا رہی تھی۔ جیسے میں کھڑکی کھول کر سر کے بل سڑک کے کھڑنجے پر گر پڑونگا۔ میرے آزار کا کوئی علاج دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر جمالی نے کہا "میں یونانی، اوڈیپس اور شیوا جی مرہٹہ سے زیادہ چالاک ہوں۔ تمہاری شادی مینو سے کرانی میری ذمہ داری ہے۔ اس کی شادی سیکنڈ لفٹیننٹ بدر سے کبھی نہ ہو

سکے گی، گو وہ ہمارے خاندان سے ہے اور تم نہیں، اسکنڈ لفٹیننٹ بدر کو اس کی ضرورت تم سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ جو اندھیاو سچل رہا ہے، میں اسے تو نہیں روک سکتا، البتہ یہ شادی ضرور ضرور روک دونگا۔

جمالی نے یہ بہادرانہ الفاظ تو استعمال کر دیئے تھے۔ اور وہ تھا بھی بڑا ہی سچا اور دلاور انسان لیکن میرے دل میں اسی وقت سے یہ الجھن پیدا ہو رہی تھی کہ جمالی اپنا قول کیسے پورا کرے گا۔ مینو کا حاصل کرنا میرے لئے قطب تک پہنچنے سے کم نہ تھا۔ اب جمالی کے قول نے بھی ایک ایسے ہی قطب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ان قطبین تک کوئی ذریعہ مجھے نظر تو نہ آتا تھا۔

۲

جمالی کے آباؤ اجداد کبھی ملک کے تاجدار رہ چکے تھے۔ ان کی جائے رہائش شاہی کوٹلہ میں تھی جس کے جنگی دروازے تھے، اور گھڑ گھس بھی تھی۔ ہمارے بزرگ ان کے سپہ سالار تھے۔ ہمارا قیام حدیقہ میں تھا۔۔۔۔ حدیقہ چہار دیواری والے باغ کو کہتے ہیں۔ حسن جہاں افروز مینو کا تعلق شاہی کوٹلہ والوں سے تھا۔ ان دونوں خاندانوں میں رشتے بیاہ ہو رہے تھے۔ جمالی کے والد کا تنازع خطاب اور پنشن کے سلسلے میں دوسرے خاندانی دعوے داروں سے چل رہا تھا۔ اور جب ملک کی آخری بڑی عدالت نے فیصلہ جمالی کے والد کے حق کر دیا تو شاہی کوٹلہ میں ایک زبردست مجلس جشن و سماع برپا

ہو رہی تھی - چوٹی کی گائن طوائفیں بلائی گئیں تھیں اور سبزہ زار چوگان میں گنٹری دار درباری شامیانے نصب تھے۔

بیگمات اور معزز مہمان خواتین نوبت خانے کے بلند پھاٹک میں بیٹھی رقص و سرود سے بہرہ ور ہو رہی تھیں۔ سامنے بانگی کے کپڑے ایسا بھینا بھینا سرخ پردا پڑا ہوا تھا۔ مرغول دار پھاٹک کے پیچھے شمال میں سنگ مرمر کے کھلے فرش پر میز کرسیاں رکھی ہوئی تھیں میزوں پر طرح طرح کے ٹھنڈے مشروبات اور پان سجے ہوئے تھے کہ خواتین جب چاہیں آئیں جب ضرورت شربت وغیرہ نوش جان کریں یا پان کھائیں، الائچی سپاری، اور زردہ چاندی کے نقشین چوکھڑوں میں رکھا تھا جس کسی کو تشنگی محسوس ہوتی یہاں آتی اور جو چیز چاہتی پیتی - اس مرمریں صحن کے ہر دو جانب، شرق و غرب، لال پتھر کی مرغول دار در دروں والی یک منزلہ عمارت تھی - دروں پر زری نہ- بیلگنی پردے پڑے تھے، یہاں بستروں کا انتظام تھا اور اندر عود دلوبان وار چینی اور دیگر مشموبات سے خلوت گاہیں معطر تھیں۔ جو کوئی تھک جائے یہاں آ کر آرام کر سکتی تھی - اس سہ گزہ عمارت کے شمال میں جو سہ دریاں تھیں، وہاں کنیزوں کے آرام کرنے کا بندوبست تھا - صحن سے وہ حویلی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے تی منزلہ پر بیٹھے ہوئے جمالی نے کہا تھا۔ " یہ جو اندھیاؤ چل رہا ہے میں اسے تو نہیں روک سکتا۔ البتہ یہ شادی ضرور۔ ضرور۔ روک دوں گا۔" میں سبزہ زار چوگان میں نصب درباری شامیانے میں بیٹھا اسی تی منزلہ کی طرف کبھی کبھی نظریں اٹھاتا ہوا

سوچ رہا تھا "کیا جمالی اس شادی کو روک سکتا ہے؟ جس طرح چلتا ہوا اندھیاؤ نہیں رک سکتا اسی طرح یہ بھی نہیں رک سکتی۔"

جب رات کی کمر ٹوٹی اور چاند نے مسجد سہ گنبد پر سے کھیت کیا اور مشروبات کی دیکھ بھال کرنے والی کچھ کنیزیں تو شمالی سہ دریوں میں سو گئیں اور کچھ بلند پھاٹک کے بیل پالیوں کے پاس بیٹھ کر گانا سننے لگیں تو حسن جہاں افروز مینو کو پیاس نے ستایا۔ وہ چمک دار وصلی کا جوتا بلا جراب پاؤں میں پہنے ہوئے صحن میں آئی۔ اس کے پاؤں گورے پن کی اور چکناہٹ میں سنگ مرمر کو مات کر رہے تھے۔ اس نے برف میں لگی ہوئی بوتل تیلی سے پی اور کچھ شربت گلاس سے پیا۔ اس وقت اس کے ذرا بھیگے بھیگے ہونٹ واقعی آب و آتش کی آمیخت کا سماں پیدا کر رہے تھے۔

وہ واپس جانے ہی والی تھی کہ ایک لمبے تڑنگے مضبوط آدمی نے اسے اس طرح اٹھا لیا جیسے چڑی مار کبوتر کو دبوچ لے۔ حملہ آور اسے پردے پڑی ہوئی شرقی استراحت گاہ میں لے آیا۔ حملہ آور کی گرفت اتنی کڑی تھی کہ وہ مینو کو تڑپنے بھی نہ دے رہا تھا۔ پھر وہ خوب ملکاں کی گئی۔ اس کا جھار کا ازار بند چاقو سے کاٹ ڈالا گیا۔ سنہری شلوار ایسے ہلکے رنگ کی کہ جیسے عطر ہو، تار تار ہو چکی تھی۔ کامدار قمیض کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ حملہ آور نے اندر جاتے ہی روشنی گل کر دی تھی۔

پھر ایک کنیز نے صحن میں شور مچانا شروع کر دیا۔ "ڈاکو ڈاکو، بیگم مینو

بیگم مینو، دوڑیو، دوڑیو! اس شور پر بلند دروازہ میں بیٹھی تمام مستورات صحن میں ڈھوک آئیں..... اخفائے واردات...... ناممکن تھا۔ حسن جہاں افروز مینو تو گویا چھاپے میں چھپ گئی تھی، اس کے بدنامی کا ٹیکہ لگ چکا تھا۔ مردوں تک خبر پہنچ گئی، بے چاری خستہ اندام، دریدہ ملبوس، حسن جہاں افروز مینو کچھ ہی منٹ میں ایسی بن گئی تھی، جیسے ڈربے کا دروازہ بند ہو گیا ہو، کوئی مرغی باہر بیٹھی رہ جائے۔ رات کے سناٹے میں باہر بلاؤ بھاڑنے لگے تو وہ چیخ و پکار ہو کہ ہمسایوں کے بچے تک بستر میں بھڑک بدک کر جاگ پڑیں۔ مینو کے عطر ایسے ہلکے سنہرے رنگ کی شلوار سرخ ہو رہی تھی، چولی کے بٹن اور تکمے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کا زعفرانی دوپٹہ، رومال، کانوں کا ایک جواہر جٹا آویزہ اور اس کے چہرے کی دغدغاہٹ یہ سب غائب تھے۔ تشہیر اتنی ہو چکی تھی کہ اس سے کوئی کچھ بھی نہ دریافت کرتا تھا۔ اس کے منہ میں بول بھی نہ تھے، امرود ادھ کھایا ہو چکا تھا۔ لٹکائے گوٹے کے جدید پھاٹک کھل چکے تھے۔ کنیزیں بار بار ماشار حمان، ماشاءاللہ کہتی پھر رہی تھیں۔

۳

سیکنڈ لفٹیننٹ بدر اور حسن افروز جہاں بیگم مینو کی شادی عشق و محبت کی اساس پہ نہ ہو رہی تھی۔ جو اس کی بنا عشق و محبت ہوتی تو اس کا توڑنا مشکل ہوتا اور مینو اس واقعے کی مجرم بھی نہ گردانی جاسکتی تھی۔ جو کوئی راہ

بجا رہا ہو۔ لیکن کوئی دوسرا اسے زبردستی پکڑ کر کچھ دیر کو بادۂ سکاہ کرنے تو اسے بے راہ تو نہیں کہہ سکتے۔ پر یہاں تو مسئلہ ہی دوسرا در پیش تھا۔ عورت کی عصمت ایک مرتبہ گئی تو سدا کے لئے گئی۔ ادھ کھائے امرود کا کوئی گاہک نہ تھا۔ گو رشتہ قطع کرنے کی کوئی باقاعدہ اطلاع تو نہیں دی گئی تھی لیکن بدر کی طرف سے یہ رشتہ منسوخ سمجھا گیا تھا۔ جس طرح سے ہٹلر کو کسی ملک پر حملہ کرنے سے پہلے الٹی میٹم کی ضرورت محسوس نہ ہوا کرتی تھی۔ اس طرح بدر کی جانب سے اس ضمن میں کوئی اعلان متوقع نہ تھا۔ اب میرے امتحان کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ کیا میرا دعویٰ محبت فرضی تھا؟ کیا میں نے صرف بڑ ماری تھی۔ شاہی کوٹلہ میں بدر یا کوئی اور ادھ کھائے امرود کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تو کیا ہم اہلِ حدیقہ بھی انہیں کی پیروی کر رہے تھے؟

حادثے کے اگلے ہی دن مجھ سے ملے بغیر جمالی پہاڑ پر چلا گیا تھا ورنہ اسی سے اپنے دل کی بات کرتا۔

ادھر مینو کو یہ معلوم تھا کہ میں اس کا خواہش مند ہوں۔ اگر دنیا میں اس کی کسی مرد ذات سے کچھ تھوڑی بہت بے تکلفی تھی، تو صرف مجھ سے تھی۔ میں نے تو خلافِ تہذیب و اخلاق اس سے محبت کا اظہار تک کر دیا تھا۔ رواج کے مطابق ان دونوں خاندانوں میں بیٹی والے کسی صورت بھی بیٹے والوں کو رشتہ کی پیشکش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس تھوڑی بے حیا بے تکلفی اور منہ پھٹ پنے کی آڑ لیتے ہوئے جو میری مینو کے ساتھ تھی یا

وہ چاہتی تو میر احمد بہ حیثیت فنکار اُسے جتا سکتا تھا کہ "کیسے محبت وحیثیت اب
بھی باقی ہے یا اس کا مرنڈا بن چکا۔" اب اس کا امن میرے دل میں تھا۔
اور یہی وجہ تھی کہ وہ میری چھوٹی بہن اور اپنی سہیلی کی معمولی سی علالت کی خبر پاکر
عیادت کو پہنچی تھی۔ گو کل بارہ خانم کو صاحب فراش ہوئے دو دن ہو چکے
تھے۔ لیکن اسے نزلے کا معمولی بخار اور آدھے سر کا درد ہی تو تھا۔

چنانچہ شام کی چائے پر جب باہر بجلی چمک رہی تھی اور بادل ایسا گھمنڈ
ہوا تھا جیسے اب برسا، اب برسا، میں اس ترکِ ناز کی مدامی خنداں اور تنقیدی
نگاہوں میں نچلا پن دیکھ کر یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ آج یہاں کس
مقصد کے لئے پہنچی ہے۔ میرے دل کو یہ تسلی ہو رہی تھی کہ وہی شاخِ
گل جس کے لئے میں کب سے دل پہ ہاتھ دھرے فقیروں کی طرح پلہ پسارے
پھر رہا تھا، وہ شاخِ گل شجر سے کٹ کر کسی دوسرے کے پتے میں گرنے
کو اس طرح سے لٹک چکی ہے جیسے کسی کا زخمی ہاتھ گلے بند سے کھل
کر لٹک گیا ہو۔ آج وہ پلہ جس میں وہ گرنا چاہتی تھی، مجھ سے ہٹا لیا گیا تھا
اب اسے گرنا تھا تو یا آکر جوتوں کی جگہ زمین پر یا شجر پر ہی لٹکے لٹکے سوکھ جانا
تھا۔ میرے خیال میں اب وہ اتنی عاجز آ چکی تھی کہ اس آس پہ میری طرف
جھکے کہ میں اسے گرد آلودگی سے بچانے کے لئے اپنا پلہ پسار دوں گا۔

میں نے اسے پورے ایک سال سے نہ دیکھا تھا۔ ہماری آخری
ملاقات حدیقہ ہی کے سینڈوریٹ آمروں میں ہوئی تھی جب وہی عشقیہ
شادی کا ذکر آیا تھا۔ زیادہ عرصہ گزر جانے کے سبب اب میرے دل میں

اس کی وہ تڑپ باقی نہ رہی۔ اور میں اسی لئے مذبذب تھا کہ ایک گرے ہوئے موتی کا مول کروں یا نہ کروں پر آج جب میں نے اس کی مضمحل صورت اور نچلی نچلی آنکھیں میز کے دوسری طرف سے دیکھیں تو اوسان بجا نہ رہے۔ میں سوچنے لگا جو وہ مجھ سے سوال کرے "کہیے اب بھی آپ اسی نظریئے پر قائم ہیں، کہ پہلے پیار اور پھر شادی" تو کیا میں اس کا جواب یہ دونگا "میں اب اس نظریئے پر قائم نہیں ہوں۔ "نہیں میرا جواب تو یہ ہونا چاہیے" مینو مجھے اب بھی تمہاری ویسی ہی آرزو ہے۔"

۴

تو ہم شام کی چائے حدیقہ والی کوٹھی کے شرقی حصے میں پی رہے تھے جس کے آگے جھمکدار طوطا پری آموں کی زیبائش تھی۔ گل پارہ خانم کا بستر علالت انتہائی جنوبی کمرے میں تھا۔ مینو چائے پی کر اسی کے پاس چلی گئی تھی۔ بڑی جنوبی کھڑکی کے پاس صوفہ اس طرح سے رکھا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھ کر باہر دیکھ سکتے تھے۔ مینو اسی صوفے پر بیٹھی پیانو بجا رہی تھی کیونکہ گل پارہ خانم کے آدھے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اور مینو یہ کہا کرتی تھی کہ وہ ایسا پیانو بجاتی ہے کہ کیسا ہی درد سر ہو آرام ہو جاتا ہے۔ مریضہ کے درد سر کو آرام ہوا ہو یا نہیں، البتہ مینو نے پیانو بجا کر میزبان کو سلا ضرور دیا تھا۔ اور تکلیف میں سونا بھی آرام کے مترادف ہے۔ مینو نے یہ غزل چھیڑ رکھی ہوئی تھی ؎

اس کو پا کر بھی اسے پانے کی حسرت چاہیے
وصل میں بھی چاشنیٔ دردِ فرقت چاہیے
گو ہیں ان معصوم آنکھوں میں سزاوار خیال
کچھ شرارت بھی مگر حسبِ ضرورت چاہیے
اجنبیت جنکی فطرت بے رخی جن کا شعار
کچھ نہ کچھ ایسوں سے بھی صاحب سلامت چاہیے

لوکاٹوں کے گھنیرے گھنیرے ماحول میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں اب بھی بول رہی تھیں۔ میرا دل مینو سے باتیں کرنے اور دیکھنے کو چاہ رہا تھا یہ بات اسے خاص طور پر اور فوراً ہی سنا دینی تھی کہ میں اب بھی اپنے نظریے پر قائم ہوں اور میں وہی سوختہ سامان ہوں جسے تم یا تمہارے گھر والے مسترد کر چکے ہیں۔

میرے قدم مجھے خود بخود لوکاٹوں کی ٹکڑی میں لے گئے اور خود بخود یا شاید مجھے کھڑکی سے وہاں دیکھ کر مینو بھی ٹیوب ویل کے پاس سے ہوتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ وہ اس جھٹ پٹے کے وقت میرے ساتھ تنہا تھی اور اب بھی سانجھ چڑیوں نے طوفان بدتمیزی مچا رکھا تھا۔ مینو کی وہاں پہنچنے کی علت میری سمجھ میں یہی آتی تھی کہ اسے مجھ سے یہ دریافت کرنا تھا کہ "کیسے اب کیا ارادے ہیں" ہم چند منٹ لوکاٹوں میں ٹھہرے ہوں گے۔ شائد اس نے کچھ کہا ہو لیکن چڑیوں کی بم چیخ نے کچھ نہ سننے دیا۔ اور جب میں نے کچھ سنا ہی نہ تھا تو جواب کیا دیتا لیکن میں کچھ سلوں یا جو

سنوں ۔ وہ کچھ کہے نہ کہے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ میری طرف شادی کا ہاتھ بڑھا رہی ہے ۔

مینو رات بھر حدیقہ میں ٹھہر کر اگلی صبح شاہی کوٹلہ لوٹ گئی ۔ اس کی اس بے توقع آمد نے میری چاہت کو ہزار گنہ رنگ دے دیا تھا ۔ جب امید بر آنے لگے تو طبیعت بھڑک ہی جایا کرتی ہے ۔ میں نے گل پارہ خانم کے ذریعے والدین سے کہلوایا ، کہ وہ مینو کے لئے ابتدا کریں لیکن وہ تو یہ رشتہ ذرا بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھے ۔ والدہ برملا کہتی تھیں ۔ وہ تتلی جیسے ہمارے پھولوں پر سایہ ڈالنا گوارہ نہ تھا تو جب کسی کل چڑے نے اس کے پروں میں بھمبا کا کھول دیا تو اب وہ ادھر کیوں اڑ اڑ کر آنے گی ۔ فوجیوں کی کمی نہیں ۔ وہ اب بھی کوئی اور فوجی ڈھونڈ لیں ۔ بس وہی ادھ کھائے امرود کا مسئلہ درپیش تھا ۔ یہ لوگ مینو کو کسی صورت بھی بہو بنانے کو تیار نہ تھے ۔

میں نے مینو کو چٹھی لکھی ، اس میں کوئی القاب نہ تھا ۔

مینو !

تمہیں معلوم ہی ہے ، کہ میں تمہارے لئے کب سے بیقرار پھرتا ہوں ۔ حالانکہ تمہارے والدین مجھے مسترد کر چکے ہیں ۔ ۔ ۔ اب کیا ہو گا ؟ ادھر میرے گھر والے بھی نہیں مانتے ، تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ ، یہ نہ مانیں تو نہ مانیں میں اس ضمن میں آزاد ہوں اور تم بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مینو نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ تو میں نے فون پر بات کی۔

"میرا خط پہنچ گیا ہوگا؟"

"جی......."

"اس کا جواب؟"

"ایسے خط شرمندۂ جواب نہیں ہوا کرتے، آپ سے خط و کتابت روا نہیں۔"

"تو پھر میرے گھر والے تو راضی نہیں۔"

"وہ رضامند نہیں تو ہم بھی رضامند نہیں۔"

"کیوں؟...... قصور؟"

"جب تک ہمارے والدین رضامند نہ ہوں"

"تو میں کب تک یوں بیٹھا رٹتا رہوں؟"

جب تک پن کال نہ پڑ جائے۔

۵

جب میں نے یہ داستان شاہی کوٹلہ کے اسی سہ منزلہ پر بیٹھ کر ساون کی ٹھنڈی ٹھنڈی، بھیگی بھیگی مگن ہوائیں سانس لیتے ہوئے جمالی کو سنائی تو اس نے کہا "عالی خاں! سب ٹھیک ٹھاک ہو جائیگا۔ چنانچہ اس نے میری عدم موجودگی میں کوئی جادو چلاتے ہوئے میرے والدین کو درست کر لیا۔ لیکن جب مینو کے گھر پیغام رسانی کی گئی، تو وہ نہ مانتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس طرح لڑکی سسرال میں خوش نہ رہ سکے گی۔ حدلیقہ

والے ہمیشہ سوچتے رہیں گے کہ اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آچکا ہے۔ یہ عفیفہ نہیں، اور اسی لئے ہمارے لائق بھی نہیں ہے۔ اسے کیوں سر مڑھا گیا۔ یہ کچوکے کس سے برداشت ہو سکیں گے۔" شادی اب پھر جوکھوں میں پڑ گئی تھی۔ جمالی مینو کے گھر جانے کو تیار نہ تھا، البتہ اس نے اس کنیز کو وہاں بھیجا جس نے مرمریں صحن میں اس رات شور مچایا تھا۔ اس کنیز کے ساتھ ایک مفصل خط، مینو کا دوپٹہ، رومال اور کانوں کا ایک جواہر جڑا آویزہ بھی تھا۔ اس تلبیسی واقعے کی تہہ میں جمالی کی تیز ذہنیت کارفرما تھی۔ یہ تکلف اس نے میرے لئے پیدا کیا تھا۔ جہن جہاں افروز بیگم مینو سمپورن تھی۔ امرود کے کسی کے ہونٹ تک مس نہ ہوئے تھے۔ لٹکا کے کوٹ میں تاحال ایک ٹانکی نہ پڑی تھی۔ یہ سارا کھیل جمالی نے اپنی بات پوری کرنے کو رچایا تھا۔

اب اس عفیفہ کا رشتہ بدر سے بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن اس طرف سے جو سرد مہری برتی گئی اس نے پالا الچٹا دیا۔ بدر بہت تڑپا لیکن اس نے تو چراغ سے اپنی بتی خود ہی نکال لی تھی۔ اب وہ چراغ دوسرے کی بتی سے روشن ہونے والا تھا۔ اور یہ روشنی یقیناً زیادہ اجلی اور دیرپا ثابت ہونے والی تھی۔ سیکنڈ لفٹیننٹ بدر کو دوسرا موقع کون دیتا۔

بکھرے بکھرے چھدرے چھدرے سفید سفید بادلوں میں نیلا آسمان نظر آرہا تھا۔ صحن چمن میں مولسری کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے تیلیا نیلے بازوؤں اور سفید پیٹ والے پہاڑی کستورے ٹنر ٹنر کرتے ہوئے کوٹھے کے پیش گاہ پہ اڑتے بیٹھتے پھر رہے تھے۔ ان کی ٹرڈ ٹرڈ سے چاؤ کی خوشی پھوٹ رہی

تھی۔ میں شام کے وقت لان میں سوگئی اور کسمسایہ سا بیٹھا پیڈسٹل پنکھے کی ہوا کھا رہا تھا کہ جمالی نے آکر مجھے یہ فرحت آمیز خبریں سنائیں۔ اور میں نے اس کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں سے از راہِ تشکر چوم لیا۔ جو اس کی کوشش نہ ہوتی تو معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ مجھے اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ جنگلی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا پھرنے لگوں۔

جب اہلِ حدیقہ اور شاہی کوٹلہ والوں کی باہمی غلط فہمیاں دور ہو گئیں تو میں اور مینو وہبا دلہن بن گئے۔ میں نے اوّل ملاقات میں اس سے کہا۔

"پہلے پیار پھر شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار۔"

"پہلے تو میرا نظریہ اس سے کچھ مختلف تھا۔ اب اپنا نظریہ کوئی نظریہ نہیں رہا۔"

"کس لئے"

"اس لئے کہ اب تو شرعاً و عرفاً جو آپ کا نظریہ ہے، وہی میرا بھی ہے۔"

"پہلے تو آپ مجھے لاجواب کر دیا کرتی تھیں۔"

"اب آپ ہیں ہی ایسے لاجواب کہ جس طرح مجوسی آگ کو پوجتا ہے۔ ہمیں آپ کی پوجا کرنی چاہیئے۔"

"پہلے مجھے آپ میں بڑا دخل فصل معلوم ہوا کرتا تھا"۔۔۔۔۔

۔۔۔"اب میں وہ دستور العمل چھوڑ چکی ہوں، اب تو لاریب آپ کی زندگی

میری کی رضا ہے۔ اور وہ جو پہلے مجھ میں دخل فصل معلوم ہوا کرتا تھا وہ دخل فصل ہرگز دیتا سبھے تو آپ سے بڑی نزدیک کی نسبت تھی۔ آپ تو شہ رگ سے بھی زیادہ میرے قریب تھے۔ لیکن میری جبلت تربیت وضع داری نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ میں آپ کو جواب با ثواب نہیں دے سکتی تھی۔ مسیح مرد ہونے کے باوجود جب مصلوب کیئے گئے تو چلائے تھے۔ آٹھ پہر ضبط کی سولی پر ہونے کے باوجود میرے منہ پر نالہ و فریاد نہ تھا۔ میں اپنے ضبط کی خود آپ کو داد دیا کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی میرا قدم بھی ڈگمگانے لگتا تھا۔ مثلاً جب آپ سپر سپر چائے پی رہے تھے تو آپ نے مجھے قتل ہی تو کر ڈالا تھا۔ آپ کے اُن سپر سپر کرتے ہوئے ہونٹوں کی جنبش کیا بتاؤں کیسی معلوم ہوتی تھی، بس میں بتا نہیں سکتی۔

"پر آپ تو مجھے چڑانے کے لئے خود بھی سپر سپر چائے پینے لگی تھیں۔"

"آپ نے وہ سپر سپر تو ملاحظہ فرمائی تھی لیکن یہ ملاحظہ نہ فرمایا تھا کہ میں اپنے ہونٹ بھی تو کاٹ رہی تھی۔"

"لیکن جو کہیں آپ کی شادی اس فوجی سے ہو جاتی تو کیا آپ کو پھر بھی میرا خیال رہ سکتا تھا۔"

"کبھی بھی نہ رہ پاتا۔ جو میں اس کی ذرا سی سرسراہٹ محسوس کرتی تو اسے اس طرح سے علیحدہ کر دیتی جیسے ترازو کے پلڑے سے تولا ہوا بوجھ۔ اور میں اپنی طبیعت بدر سے ذوق و شوق کے ساتھ باندھ لیتی۔"

(ہفت روزہ نصرت لاہور)

ننگ پیری

بھر ساون کے کڈھب پانیوں سے موضع جری پوری کے تالاب لبالب ہو کر بہہ نکلے تھے۔ بھدواڑیں پانی پی پی کر خوب چھلک گئی تھیں اور ان میں گھنا زور رسانوک پھپھول دے گیا تھا۔ کئی جری دھوپ نہ لگنے اور متواتر بارشوں کے کارن نیلی پڑ گئی تھی۔ غوثے نمبردار کی بالکڑی نیلی گائے کا گریشم میں دودھ سوکھ گیا تھا۔ تو اس کے تھنوں کو بھی ہاتھ لگانے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اب بھدواڑیں پیک کر اس کا دودھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ بچھڑی چونگھ کر قصائی کے بلے ایسی موٹی ہو گئی تھی۔ آموں کے باغوں میں ہوا کا زوردار جھونکا ٹپکے کے چلوں کی بھد بھداہٹ ساتھ لاتا تھا۔

مینہ کی دناونی نے سدسی دوج سے شروع ہو کر ناگ پنچمی اور سلونو کے تہوار گزار دیئے تھے۔ گویا آسمان پھٹ پڑا تھا۔ آج ابر غلیظ چھنٹ کر دھوپ نکل تھی۔ گولروں تلے گولر اور نیموں تلے نبولیاں پھیلی ہوئی تھی۔ نیموں کی مولیں اور پتے دھوپ میں مہک رہے تھے۔ نو وارد پل کے اتر میں ہندو راجپوتوں کا دیسی آموں کا اور اس سے ادھر سڑک کے دو طرف غوثے نمبردار کے قلمی آموں کے باغ تھے۔ یہاں سے آموں کے ٹرک

شہر جا رہے تھے۔ جو جری پوری سے پانچ میل پچھم میں تھا۔

ساون کے پانیوں سے پورم پور بھرے ہوئے تالابوں میں راج ہنس بڑی آن بان سے تیر رہے تھے۔ باغوں میں کوئلیں کوک رہی تھیں۔ گاؤں میں مرغ بانگ دے رہے تھے۔ کچھ پٹھوں نے ابھی بانگ دینی شروع کی تھی۔ یہ اسی پود کا حصہ تھے جو آتی گرمیوں انڈوں سے نکلی تھی۔ لیکر پر گھونسلے میں کووں کے بچے بولتے تو ان کی چونچوں کا اندرونی حصہ شنگرفی شنگرفی دکھائی دیتا تھا۔

گاؤں کی گلیوں میں کیچڑ سا ہو رہا تھا۔ اگر پاؤں رکھتے تو ٹخنے اور پنڈلیاں تک سن جاتیں۔ لیکن شہر والی سڑک کے پار جو اونچان تھی وہاں آل کم تھی۔ اس لئے یہاں خانہ بدوش باگڑی لوہاروں نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ اس کے جنوب میں ٹھیکے پر ہریالی پھیلی ہوئی تھی جس کے دو طرف تالاب تھا۔ باگڑی لوہاروں کی کالی چھولداریاں اور جھڑے ٹالاب کے پاس ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے یہ بھی اس ماحول کا حصہ ہوں۔

باگڑی لوہاروں کا قافلہ یہاں سالانہ سلونو پر آتا تھا۔ یہاں کی جگہ سنداں پر رکھے ہوئے لال لوہے پر کبر ولوہار لڑکیاں ہتھوڑے گھس لگا رہی تھیں جن سے دھرتی دہل رہی تھی۔

جہاں شہر کے لیے تانگے کھڑے ہوتے تھے اسدین پر پہنچنے کی جلدی ایسی گویا ہی لڑکی شکل پکش اور گول کے سے گالوں والا لڑکا سبھاش لال لوہاروں کے پڑاؤ کی طرف جا رہے تھے۔ کیچڑ بھری گلیوں کے سبب انہوں نے

جوتے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ شکل کی کرتی کا رنگ ہلکا جوگیا تھا۔ اور گھگری ہلکی سرمزی، اس کے کانوں کے انار کلی گوشوارے بل ہل کر لمطازی اور طمطراق دکھا رہے تھے۔ ناک کی ترچھی نقرئی پھلی کا رنگ چہرے سے ہیٹا تھا۔

جب بہن بھائی سادھو کی مرھی کے پاس پہنچے تو گردھر گھاٹیا کھیرا بھی باگڑی لوہاروں سے کلہاڑی خرید کر لاتا ہوا مل گیا۔ وہ شکل کو یوں دیکھتے ہوئے جیسے وہ اُسے جستجو کے بعد ملی ہو ایک دھاپ تک چلا گیا۔ سوبس لال کو کھیرے کی یہ دیدہ دلیری ناگوار گذری تو اس نے اسے منکا دکھا دیا۔ اب یہ تو ٹھہر گیا اور وہ گذرتے ہوئے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد کھیرے کی یہ حالت ہوئی جیسے وہ اپنی عزیز چیز کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے گیا ہے۔ وہ گینگ دے سے جہاز میں بیٹھ گئی۔ پھر جہاز اڑا۔ اس کی نگاہیں جہاز پہ تھیں۔ پھر جہاز اوجبل ہوتے ہی اس کا دل ہوک سے لچکنے لگا۔ اسے شکل کے ننے ہوئے ننگے پاؤں یاد آ رہے تھے۔

۲

کھیرے کا اصل نام کرشن بکش تھا، ماں باپ اس کا پکا رنگ دیکھ کر پیار میں کھیرا کہنے لگے۔ اس کا نام منصب رائے نے رکھا تھا۔ دو سال بعد جب سعدین پہ چوتنے کے لڑکا پیدا ہوئی تو اسی نے اس کا نام شکل بکش رکھا تھا اور بعد کو پیدا ہونے والے بھائی کا نام سبھاش لال جسے سوبس لال

یا سو با کہنے لگے تھے۔

ہندو گاؤں والے بچوں کا نام منصب رائے ہی سے رکھواتے تھے جس کی فیس چار آنے تھی۔ جنم کنڈلی دیکھنے کا یا شبھ لگن بتانے کا وہ ایک روپیہ لیتا تھا۔ نام رکھنے کی اجرت تو اسے مل جاتی تھی لیکن جنم کنڈلی کا روپیہ دقت سے وصول ہوتا اور جو یہ نہ ملتا تو کہنے لگتا۔ میں نے اس بچہ کی کنڈلی دیکھ لی ہے۔ قسمت بڑی اشبھ ہے۔ کرشن بکش، کھیم سا اور شکل بکش کی بابت بھی اس نے یہی کہا تھا کہ ان کی قسمت بُری ہے کیونکہ اسے روپیہ نہیں ملا تھا۔

اسے کچھ جوتش شاید آتی ہو، بیدائی نہیں آتی تھی۔ وید وہ اس دن مشہور ہوا تھا جب اس نے بوتلوں میں بھرا ہوا رنگین پانی، اور ڈبوں میں رکھا ہوا آٹا کباڑ اپنے ویدک اوشدھالیہ سے باہر پھینک دیا تھا اور بھری پینٹھ میں گڑ ننگ ماری تھی کہ دوائیاں پرانی، کم اثر ہو رہی تھیں انہیں ضائع کر رہا ہوں، ان کی جگہ نئی زود اثر دوائیں استعمال کرونگا۔ نقصان کی پرواہ نہیں۔ نہ مجھے لالچ ہے۔

وہ پنڈت مدن موہن مالویہ آنجہانی کی طرح سر پہ دستارچہ رکھتا تھا۔ کمر اور کاندھے میں پھینٹے کی طرح سے پڑا ہوا پٹکا۔ دستارچہ بیدائی کی نشانی تھا۔ پٹکا جوتش کی۔ وہ خود کو وید جوتشی جی کہلایا کرتا تھا۔ اگر کوئی صرف وید جی یا جوتشی جی کہہ دیتا تو اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ آنکھ کان۔ دانت کی دوائیاں اس کے ویدک اوشدھالیہ سے مفت تقسیم ہوتی تھیں۔ لیکن کوئی اگر صرف

وید جی یا جوتشی جی کہہ دیتا تو اسے یہ دعائیں دیتیں۔ صحیح تخاطب پر البتہ یہ سزا معاف کر دی جاتی تھی۔ جو بچہ وید جی جوتشی جی کہہ دیتا تو اسے گھیلوا ملتا جو ایک نکتی کی گرہ ہوتی تھی۔

اپنی بیدائی کی بڑ ہانکنی ہوتی تو زکام کھانسی، بخار کے معمولی مریضوں کا علاج کرتے ہوئے دعویٰ کرتا کہ مجھے جوتش سے بھی معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مریض ضرور اچھا ہو جائے گا۔ اور مریض اچھا ہو کر جاتا تو وہ خوشی میں اپنے علم کا چرچا کرنے کے لئے نستعلیق بولنے کی کوشش کرتا ہوا کچھ کا کچھ بول جاتا۔ مثلاً خوشی نمبردار کو خوشا نمبردار کہتا۔ گنواری سے اُسے پرہیز تھا۔

منصب رائے کو سانپن کی بیماری تھی۔ داڑھی، مونچھ اور بھنوؤں کے بال تو پہلے ہی گر چکے تھے۔ اب گنج بڑھ رہا تھا۔ صورت عجب مضحکہ خیز تھی۔ رنگت لال تھا۔ اسے ماٹھو اور ماٹھو مچھندر بھی کہتے تھے۔ یہ نام اسے کیسے ملے ایک دلچسپ بیان ہے۔

اوشدھالیہ کے باہر گلی میں ایک تختہ سیاہ لگا ہوا تھا جس پر وہ جوتش کا حساب دیکھ کر ہر روز چاک سے دشاشول لکھ دیا کرتا تھا یعنی آج کدھر سفر کرنا منحوس ہے۔ ان پڑھوں کے لئے منحوس سمت کی طرف تیر بنا دیا جاتا تھا۔ سوہن لال کو کچھ ڈرائنگ اچھی آتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے تختہ سیاہ پہ بندر اور اس کی دم بنا کر نیچے لکھ دیا۔ منصب رائے ماٹھو ماٹھو مچھندر۔ اس قلم کاری کو دیکھنے کے لئے وہاں ایک اچھا مجمع ہو گیا۔ جس میں کچھ مقامی پرائمری سکول کے طالب علم تھے۔ جو نعرے لگانے لگے۔۔۔۔

منصب رائے۔ ماٹھو، ماٹھو مچھندر۔ انہی دنوں سوبس لال نعرے لگانے لگا۔ ماشو، ماشو منشدر۔ ٹھے اور چھے کی جگہ شین کا استعمال اس لئے کیا گیا تھا کہ دید جوتشی جی غوثئے کو غوشا اور سوبس کو شباس کہتا تھا۔ اوشدھالیہ کا ملازم یہ بے ادبی روک رہا تھا کہ منصب رائے آ گیا۔ اس نے جو یہ نقشہ دیکھا تو پہلے تو بورڈ کی تحریر ہاتھوں سے مٹائی اور پھر اندر سے چھڑی اٹھا لا کر گالیاں دیتا ہوا مجمع پر پل پڑا۔ اس بھگدڑ میں کتا جھبو نامی ایک طرف ہٹا بھونک رہا تھا۔

مجمع منتشر تو ہو گیا۔ لیکن لڑکے دور کھڑے ہوئے تالیاں بجا کر وہی نعرے لگا رہے تھے۔ منصب رائے نے دید جوتشی نے ان کا تعاقب کیا۔ تو کوئی کہیں کوئی کہیں کھڑا وہی نعرے لگا رہا تھا۔ پھر جس طرح اورنگ زیب مرہٹوں کے قلعے اور مڑھیاں تو سر کر سکا لیکن مرہٹہ قوم کو زیر نہ کر سکا۔ منصب رائے نے لڑکوں کو کمین گاہوں سے بھگا دیا لیکن وہ شہر پر فتح نہ پا سکا۔ اگلے روز وہ سوبس لال کی شکایت کرنے سکول پہنچا۔ وہاں چھٹی ہو رہی تھی لڑکوں نے پھر وہی نعرہ لگا دیا۔ وہ ناک کھا کر چلا آیا اور تختہ سیاہ اتار کر اندر رکھ لیا۔ اور یوں دید جوتشی منصب رائے ماشو اور ماٹھو چھندر بھی بن گیا۔

انہی دنوں کوئی منصب رائے کو چکوروں کا جوڑا دے گیا۔ وہ اس پر اتنا مائل ہوا کہ مریض آئے ہوئے ہیں اور وہ چکوروں کے پاس بیٹھا فضول سیٹیاں بجا رہا ہے کہ وہ بولیں گے حالانکہ سیٹی پر تیتر بولتا ہے اور چکور تو خود ہی اس طرح بولتا ہے جیسے انسان ہنس رہا ہو۔ جب یہ چکور ہنسنے لگتے تو جس لڑکے

کو دیکھو او شدھالیہ کے پاس سے ہنستا ہوا گذر رہا ہے۔ منصب ملتے اس پر بھی کڑھنے لگا۔ اب اس نے تحمل برتا۔ کچھ دن گون متحیرن رہنے کے بعد جوڑا واپس کر دیا۔ لوگ پھر آ آ کر پوچھتے تھے! "وید جی، جوتشی جی۔ چکور کہاں گئے؟ بڑی سوہنی جوڑی تھی" دوسرا جواب دیتا "اڑ گئے ہوں گے۔"

وید جی کے گدی پر گئے بھتو کا جسم اور چہرہ مہرا اسی جیسا تھا۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے تھے، نیچی ہوئی آنکھیں اور پھولا ہوا منہ۔ دونوں ہی بھولے بھالے معلوم ہوتے تھے۔ کتا ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کئی مرتبہ کتے نے اس کے پیچھے پیچھے مندر کا پرکرما بھی کیا تھا۔

۳۷

جری پوری کی آبادی ایک ہزار ہو گئی جہاں ایک پرائمری اسکول بھی تھا۔ اتوار کو پینٹھ لگتی تھی۔ پکھیرے کے باپ گردھر گھاٹیے کی جھونپڑی سی کچی پکی حویلی مندر کے پاس تھی۔ شنکل کا خاندانی اینٹوں والا گھر اسکول کے سامنے پینٹھ والے پر تھا۔ پینٹھ والے کی دوکانوں اور کھلی جگہ کا مالک، غوثیہ تھا۔ کھلی جگہ سے پینٹھ کی آمدنی ہوتی تھی اور دوکانوں سے کرایا آتا تھا۔ سعدین پر چونے کی دو دکانیں تھیں مدرسے کے پیچھے تھی۔ سو یا یونہی شوقیہ طور پر کبھی کبھار پینٹھ میں کھیل کھلونے بیچنے بیٹھ جایا کرتا تھا ورنہ ویسے سعدین کی چوکھی آمدنی تھی۔

ایک مشہور کہاوت ہے جو برہمن گورا نہیں وہ برہمن نہیں، جو چمار کالا نہیں وہ چمار نہیں۔ یعنی اگر ایسا ہو تو ان میں کھوٹ ہوتا ہے۔ شنکل کی چندرہی

ایسی رنگت اس کی بہن دلیل تھی کہ وہ نسل در نسل برہمن ہے ۔ کھیرا اور اس کا باپ کالے تھے ۔

اتوار کی چھٹی تھی تو کھیرے نے دیکھا سوبس لال آم بیچ رہا ہے ۔ اس نے سوبے سے بھاؤ کی بات چیت کی ۔ لڑکے نے دام بازار کی نسخ سے کئی گنا زیادہ بتائے تاکہ کھیرا آم نہ خرید سکے اور چلا جائے ۔ لیکن کھیرے نے تو منہ مانگے دام دیئے ۔ حالانکہ سوبے نے اسے مزید بد کانے کو ڈنڈی بھی ماری تھی ۔
پھر کھیرے نے بھولا بن کر کہا " وہ کون تھی تیرے گیل ؟ ننگ پیری ؟"

سوبا :۔ کون

کھیرا :۔ ننگ پیری

سوبا :۔ کب ؟

کھیرا :۔ جب بگڑی لوہار دلکے نے جھوڑے سے آئے ہوئے تھے ۔

سوبا :۔ اس کا نام ننگ پیری نہیں ۔ وہ تو میری بڈی بہن شکنتلا ہے ۔

کھیرا :۔ اچھا میری رام رام کہہ دیئے ۔

سوبا :۔ ہم تجھے کیا جانیں ۔

کھیرا :۔ میں گردھر گھاٹیئے کا کرشن بکش ہوں ۔ مجھے کھیرا بھی کہہ دیں ہیں ۔

سوبا :۔ میں نہیں کہنے کا ۔ جا ۔ جا ۔

سوبس لال نے کھیرے کا سلام اپنی بہن تک نہیں پہنچایا ۔ اور ان

گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ برساتی امرود چل گیا اور اب سوبے کے ٹوکرے میں امرود تھے۔ جب کھیرا خریدنے آیا تو سوبے نے پھر زیادہ اور بے جا طلبی کی.... کھیرے نے پھر منہ مانگے دام دیئے اور سوبے نے اسے دکھلانے کے لئے جھڑک ماری۔ کھیرے نے تقریب گفتار کی طرح ڈالتے ہوئے کہا۔

"امرودوں کے دام لے لئے ؟"

سوبا :۔ جا رے سئے جا

کھیرا :۔ بگڑن کیوں لگا ؟ مہر بکھت کا جھگڑا اچھا نہیں ہوتا۔ ننگ پیری کے سئے رام رام بھی لیتا جا۔

سوبا :۔ پہلوں سے گیا تھا۔ اُننے برا مانا۔

کھیرا :۔ برا کس طرؤں مانا تھا۔ ؟

سوبا :۔ کہے تھی میں ننگ پیری کہ وہ کھیرا ہے۔ جیسے پھٹرے کھیرے ہوں ہیں۔ جیسے مجھے رہکے دھور سے پھر کوڈوں کی طرح دکھتا تھا۔ مہر نہار اس کا صفایا کردے۔

کھیرا :۔ کبھی یا ہوتا مہر صفایا ہوگیا تو تیں بھی بچنے کی نہیں۔ ہم ایک ہی شے کے دو ٹکڑے ہیں۔ وہ چاندنی ہے میں اندھیرا۔ وہ سدی میں بدی ہم دونوں سدا کے ایک ہی ہیں۔ اُسے کہنا بس اسی بات پر میرے ساتھ پھیرے پھیر والے۔

سوبا :۔ تیش گھاٹیا، ہم ساگتی، اگنی ہوتری تیں تو ہمارے حلیموں کا کبھی بے گانا۔

کھیرا :۔ کہیں تو ہم نہیں

سوبا :۔ گھاٹیے تو ہو؟

کھیرا :۔ ہیں ، پر تمہاری ہی طرح برے باہمن

سوبا :۔ ارے دھت تیرے کی بھئی ، تو باہمن ہیں، پر تم بھی لگاتے دھبی لگاتے۔ تم گھاٹ پہ یاتری جماتوں کے کپڑوں کی دیکھ بھال کرتے ہو، انہیں سنیچر کے دن کالے کپڑے اور تیل دیتے ہیں۔ تمہارا ان کا میل ہے، ہمارا تمہارا نہیں۔ کاگ کبوتر ایک چکس پہ نہیں بیٹھا کرتے۔ ہمیں لوگ پالاگن کریں ہیں

کھیرا :۔ پالاگن تو نہ کہنا۔

سوبا :۔ اچھا اچھا کیا پیچھے پڑ گیا ہے۔ میں کوئی اگرا ہوں۔

آہستہ آہستہ اتوار بدھ دونوں پینٹھ والے دن ملے۔ اب سوہن لال کی گفتگو امید افزا ہوتی۔ شنکر لکش نے کہلا کر بھیجا تھا کہ وہ کھیرے سے آپ بات کریگی اسے اس کا اصلی نام سن کر کچھ انس سا ہو گیا تھا۔

***

منگل کے دن شنکر لکش گھاٹیے کے چبوترے کے پاس سے گزرتی ہوئی پینٹھ والے دن میں جانے والی تھی۔ اور کھیرا مونڈھا بچھائے چبوترے پہ اسارے تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اسارے پہ مالتی چڑھی ہوئی تھی۔ کھیرے نے نائی سے بال بنوائے، شیو کرایا، مانگ نکالی، ململ کا بیلدار کرتا پہنا، چوڑی کنی کی دھوتی باندھی اور مونڈھے پر ڈٹ گیا۔

اسے بیٹھے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ چندیلی ایسی شکل بلا اٹک مٹک، گوڑ اپلے اور فربہ گاؤں والے بھائی کے ساتھ کترا کر پاس سے گذرتی ہوئی پن گئی۔ سامنے سے غوثا نمبردار اور گردھر گھاٹیا آرہے تھے۔ شکل نے زری کا چار و جوتا پہنا ہوا تھا۔ آسمانی دوپٹے نے اس کے چہرے کو ایسی عمدگی بخشی ہوئی تھی کہ وہ تال میں کھڑے کمل سے بازی لے گیا تھا۔ کھیرے کو اس کے پاؤں میں جوتی دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ وہ اب اسے ننگ پیری نہیں کہہ سکتا تھا۔

کھیرے کو یقین تھا کہ شکل ضرور بات کرتی اور آنے والوں سے کترا رہی کترا کر گذری ہے۔ لیکن تیسرے روز شوبے کی اس آواز نے اسے چونکا دیا۔

"وہ کہہ رہی ہے، تیں تو مجھو نٹھا ہے، ہم اگلی ہو گڑی ہیں، تیں گھوڑا تھا۔ نگر کے چاروں اور ڈھا پھر، اپنے سر پہ استرا پھروائے کے گھاٹی مار لوں گی۔ اس گیل بیاہ نہ کراؤں گی۔"

یہ سنتے ہی کھیرے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی چکی کا راچھ یا گاڑی کی دونوں پھڑیں ایک ساتھ کٹ سے ٹوٹ گئی ہوں۔ وہ اٹھ کر پچھلے راستے سے لورے والی ندی کی طرف چل دیا۔ جو گاؤں سے ڈیڑھ میل تھی۔ اس پار کا سیر کئی من کا ہو رہا تھا اور آتما کھنڈی ہوئی تھی۔ اُڑتے ریٹھے اور کاجل ایسی گھمگھم رعب دار بے پناہ گھٹا بڑی دھما دھمی کے ساتھ امنڈی آرہی تھی۔ وہ ابھی گوئند میں تھا۔ جہاں دونوں طرف گنجن کچھ ر دھاؤں کی ہریائی پھیلی ہوئی تھی اور کہیں کہیں پانی کے مارے ہوئے مکئی جوہی کے پیلے پڑے ہوئے کھیت تھے کہ دھوپ غائب ہو کر گہری چھاؤں ہو گئی۔ بہشت کی ہوا کے بھیگے بھیگے جھکوروں نے

اس کا پسینہ سکھا دیا۔

اس ہوا میں مکئی کے سٹوں کے اوپر کی سنہری گلابی بجامنی چوٹیاں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے رنگین تتلیاں یا آگ بھوڑ ٹڈے ناچ رہے ہوں .... چھتر دھاری چتنا سے آم پر جسے رستم خاں کا اسوجیہ کہتے تھے، کیونکہ اس کا پھل بہت پچھیتا آخیر اسوج میں تیار ہوتا تھا، کچھ بیلک اور مور کے بیٹھے ہوئے مالسری میں پدھائی سی گا رہے تھے، امرودوں میں پھنگیاں اور چنیہ دم بول رہی تھیں۔ نیز آسمانی بازوں اور دودھیا پیٹ والے پہاڑی کستورے اُدھر چٹ چٹ چٹ پٹا چٹ کرتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ جنگلی کبوتروں کی قطار ندی کی طرف سے آتی ہوئی مندر پر بیٹھنے کے لئے جا رہی تھی کہ اس نے گاؤں پر کوئی شکرا اڑتا ہوا دیکھا اور وہ نور دوہ کی جانب مڑ گئی۔

برساؤ اور ٹپکاؤ بادل ذرا سے جھونے کے بعد لے بڑے شہر کی طرف ڈھل گیا لیکن ٹھنڈی ہوا شام اندھیرے تک چلتی رہی۔ کیرا ندی کے کنارے چکّر پر اُگے ہوئے جھاڑ، جھنگر، اور جھاڑ جھنگ میں پھیر کر واپس آ گیا۔

۵

دن تقریباً مہینہ گذر گیا۔ اب برسات خوب پک چکی تھی۔ خربوزہ پھوار کے زرد، بانسے کے سفید، مخمل عباس کے زرد و گلابی پھول جھیریں، الکھونن، اور کونوں کھدروں میں کھل رہے تھے۔ سب سے زیادہ بہار دکھے پر تھی۔ اس

کے پھولوں اور بیلوں کا عکس تالاب کے پانی میں پڑ رہا تھا۔ جہاں بارعب راج
ہنس تیر رہے تھے۔

رستم خاں کے اسپ جسے کا آم شہر جا رہا تھا۔ عام پرندوں کے بچے بڑے
ہو کر ماں باپ سے الگ ہو چکے تھے۔ صرف کوؤں کا کوئی کوئی جوڑا اپنے بچوں کو
ابھی تک ساتھ لئے پھر رہا تھا...... جب یہ جوان بچے بولتے تو اب بھی ان
کی چونچوں کا اندرونی حصہ شنگرفی شنگرفی نظر آتا۔ کہیں گوسل بھی برابر کے بچوں کو ساتھ
اٹھائے پھر رہی تھی...... کالی کوئل اور مہوکے جا چکے تھے۔ کلسر سے پپیہے
کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مکئی میں بوئی ہوئی پھوٹ کی چھپیتی فصل چل رہی تھی۔ گاؤں میں
کوئی کوئی ہیضے کا کیس ہو رہا تھا، غریب نمبردار کا جوان بیٹا اور ریفلیج بھی اس مرض
میں مر چکے تھے۔ جسکی ذمہ داری وید جوتشی منصب ماسٹے پر تھی... کیونکہ
وہ اچھا معالج نہیں تھا۔

پھر اپنے جیدتر سے کے آم گئے ڈیگ کی ٹھنڈی اور ہری چھاؤں میں
چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پیڑ کے پرت اور پرت والے پتے وجہ سے کی
مست لہر میں ڈولتا رہتے تھے۔ سبھی اور لسوڑوں پہ گلڈ میں ٹیولا رہی تھیں،
کیکر پر جھنجھ میں بے تکبولا جھول رہے تھے۔ املتاس کی بکھلی ڈالیاں میں ابابیلوں
کا گھر تھا جس میں وہ آ جا رہی تھیں۔ کوئی کنوئیں سے سوت کی ڈوری والی
ٹنڈیں پانی کھینچ کھینچ کر نہار رہا تھا...... نزدیک ہی سبزی کی وہ ڈیڑھ بگھی
کیاری تھی جس میں ترد ھر گھاٹیے نے بھنڈی، کدو، پیٹھا، ٹنڈا، تا گرمدتھا،
لل ونہ پیر بگ منڈی لو یا ہوا تھا.... اس کی باڑ پر کریلے کے زرد پھول بہار دے

رہے تھے کھیرے کو خبر ملی کہ شنگل پکش کو ہیضہ ہو گیا۔ اس مرض میں فوری علاج نہ ہو تو مریض کے جسم سے سب پانی خارج ہو کر موت واقع ہو جاتی ہے۔ دولت مندر کے نمبردار کا بیٹا اور بھتیجا بھی صحیح علاج نہ ہونے کے سبب ہلاک ہو گئے تھے، کھیرے کو اس کا علم تھا۔ اس نے دھکے سے عالم ٹلنگے کی اجرت ٹھہرائی اور ڈاکٹر لینے کے لئے شہر روانہ ہو گیا۔۔۔ شنگل پکش تو کھیرے کو شادی سے جواب دے چکی تھی، ایک گھاٹیے اور الگنی ہوتری میں بیاہ ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن کھیرے کو پھر بھی شنگل پکش کو بچانے کی فکر تھی۔

تانگا دیوی ندی کے پل پر جو گاؤں سے دو میل تھا، گھوڑے نے ہٹ شروع کر دی۔ یہیں ماتا مندر کے مقدس گھاٹ پر یاتری نہا رہے تھے۔ اور کھیرے کا باپ، گردھر گھاٹیا اشنان کرنے والے جاتریوں کے کپڑوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ گھوڑے نے ہٹ کرتے ہوئے سڑک چھوڑ دی اور گھاٹ پر گردھر کے نزدیک آگیا۔ کھیرے نے جست لگائی تو اس کا پاؤں پائے دان میں آکر زخمی ہو گیا۔۔۔۔۔۔ اس کے باپ نے کئی آوازیں دیں "ابے کھیرے ٹھہر تو، ٹھہر تو، کہاں جا رہا ہے؟" لیکن کھیرا نہ ٹھہرا اس نے جوں توں کر کے زخمی اور خون آلود پاؤں سے تین میل کی مسافت طے کی اور شہر سے ڈاکٹر کو جیپ پر بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ شنگل پکش کا علاج یہ کہہ کر کرے کہ وہ سرکاری ڈاکٹر ہے۔

ڈاکٹر ایک گھنٹہ بعد پہنچتا تو شنگل پکش پرلوک سدھار چکی ہوتی۔ کیونکہ اس کے بدن کا پانی قریب الاختتام تھا۔ اس کے باپ کی آنکھیں اب کھلی

تھیں، ورنہ وہ تو دید جی جوتشی جی کے اور شدھالئے سے دوائیاں لا رہا تھا۔

کھیرے کے بھیجے ہوئے ڈاکٹر کو اتفاقاً ایک دوست کی کار مل گئی تھی۔ جو جری پور کے رستے سے گزر رہا تھا اس میں صرف ایک سیٹ تھی۔ ڈاکٹر کی فیس ادا کر کے کھیرے کے پاس نہ کھانے کے دام بچے تھے نہ واپسی کا کرایہ۔ وہ رات ہوئے شہر سے بھوکا اور سوجے زخمی پاؤں سے بمشکل پیدل چلتا ہوا گھر پہنچا تھا۔ اس وقت کتے مرغیوں کو اٹھا لے جانے والے گیدڑوں کا تعاقب کر رہے تھے۔

باپ کے ڈر سے اس نے گھر آ کر روٹی نہ مانگی تھی اور چبوترے پر اساسے میں کھڑی ہی چارپائی پر سو گیا تھا۔ رات بھر اُمس رہی۔ کھیرا اپنی چارپائی باہر نہ لا سکا کیونکہ تھکن اور پیر کے درد نے اس میں اتنی بھی سکت نہ چھوڑی تھی کہ وہ اٹھ ہی سکے۔ علی الصبح جب مندر میں گھنٹے اور سنکھ بجے تو گھنگھور بادل آ گیا۔ ساتھ ٹھنڈی ہوا بھی آئی اور پھر دن چڑھے تک زور سے برستا رہا۔ ابابیلیں گھونسلے میں بیٹھی ہوئی بولتی رہی تھیں کہ کب کھلے اور وہ باہر اڑیں۔

جب شکل بکیش خطرے سے باہر ہو گئی تو ڈاکٹر سے نہ رہا گیا۔ وہ کھیرے کی کارگزاری بتاتے ہوئے اس کی ستائش کرنے لگا کہ وہ کیسا مخلص ہے کہ اسی نے مریضہ کی واقعی جان بچائی ہے.... شکل کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ وہ سوچنے لگی۔ "میں نے تو اُسے کہلا کر بھیجا تھا کہ وہ بھونڈا ہے.............. کاگ کبوتر ایک جگہ پر نہیں بیٹھا کرتے۔

وہ یہ سوچ رہی تھی کہ سوہا آ گیا۔ اس نے اپنا سر بمشکل تکیئے سے اٹھانے کی

کوشش کرتے ہوئے بھائی سے کہا۔

"ڈانگدار صاحب کو میرے نٹ کھیرے نے بھیجا تھا۔ نہیں تو میں چوٹ پٹ ہو گئی ہوتی۔ پھیس، دوا دارو کے دام، بھاڑا اُسی نے دیا۔ تبیں اُنوں جاکے کہد ت، تبیں میری جان بچائی ہے، جو من میں آئے مانگ۔"

سولیس لال:۔ گیا کھیر وہ کیا مانگ لے۔

شکل:۔ انوں کہدے، جو شے وہ مانگے گا لے گی۔

اسی زمانے میں کوئی ویدجی جوتشی جی سے آنکھوں کی دوا لینے آیا۔ تفارا اُس کے منہ سے نکلا "جوتشی جی" اس پہ ویدکی تیوری چڑھ گئی، اور وہ غصہ میں ابلا تیری آنکھاں نئیں دُکھد رہئیں۔ ان میں تو ناخونا ہو گیا تھا۔ شہر جاکے ڈاکٹر سے علاج کرا۔" مریض کی آنکھیں واقعی دکھنے آ رہی تھیں، ناخونا نہ تھا۔ اس نے جل کر جواب دیا "جی تم تو نرے جوتشی ہو۔ ابھی تو گوٹے نمبردار کا پوت اور بھتیج بھو مار دیئے۔ سادین پر چوٹنے کی وجھی تمہارے ہاتھوں پر جاتی تو انوں بھی مرگھٹ پہنچا دیتے۔

۶

جب سوبا تو یہ لے کر کھیرے کے پاس پہنچا تو مینہ کی خوشخبری لانے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کھیرا اپنے پٹیوں بندھے زخمی پاؤں کو لئے ہوئے ڈیک تلے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ابابیلیں بولتی ہوئی اُسارے میں آجا رہی تھیں۔ سوبے نے ایسی صورت بنا رکھی تھی جیسے وہ وہاں آنا نہیں چاہتا تھا بلکہ بھٹک کر آ گیا

ہو۔ پھر مینہ کا تڑبڑا پڑنے لگا۔ ابابیلیں اپنے گھونسلے میں جا چھپیں۔ کھیرا
اپنا پٹیوں بندھا پاؤں لئے ہوئے اُسارے میں زمین پر جا بیٹھا۔ دو بھٹکے
ہوئے کبوتر بھی وہاں آ گئے۔ سوبا چارپائی اسارے میں سے آیا اور اس
نے بھٹکے ہوئے کبوتر پکڑنے کی کوشش کی۔ کبوتر باہر اُڑ گئے۔

پھر گھمسان کی بارش آ گئی............ آدھا اُسارا بوچھاڑ کی زد میں
تھا۔ سوبے نے چارپائی غربی دیوار سے ملا دی اور کھیرے کو اس پر لٹا کر
آپ پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ پانی کی گھما گھمی میں ان دونوں نے کوئی بات
نہیں کی۔ جب پانی گلیوں میں راج باہے چلا کر آدھ گھنٹے بعد تھما تو ابابیلیں
تواتی ہوئی باہر گئیں اور سوبے نے کہا۔

"جتنے شہر سے ڈانگدار بھیجا بھیجیں وہی، شکل نے اُنتو رام رام بھیجی ہے
اور کہا ہے وہ جو شئے مانگے گا، اُنتو ملے گی۔"

اب کھیرے کو یقین ہو گیا کہ شکل پکش اس کے ساتھ ہے۔ گو ڈاکر مر جا چکا
تھا لیکن ڈاکر ڈالنے والے کی کامگذاری سارے گاؤں میں مشہور ہو چکی تھی کہ جو وہ
ہمت نہ کرتا تو شکل نہ بچتی۔ لڑکی کے مشکور باپ نے سو روپے اُدھر کھلے بیٹے
کے پاس بھیجے وہ انہیں سدین پر چوتنے کو واپس کر آیا کہ جیسے لڑکی اس کی ہے
ویسی ہی اس کی ہے۔

کھیر اُگھاٹیا برہمن تھا اور شکل ساگنی برہمن تھی اور سائیں اگنی ہوتری بھی کہتے
تھے۔ یہ اونچا گوت تھا۔ عام حالات میں کوئی اگنی ہوتری اپنی بیٹی گھاٹیوں میں نہیں
دے سکتا۔ البتہ گھاٹیوں اور راشٹریکیوں میں ناتے ہوتے رہتے تھے شکل کی

رضامندی بیکار تھی۔ بیاہ کا اختیار باپ اور برادری کو تھا۔ لیکن سارے ہی گرام واسی، کیا ہندو کیا مسلمان، اشکل اور کھیرے کا بیاہ کرانے پر تلے ہوئے تھے۔
غوثہ نمبردار جو گاؤں کا سب سے معتبر، دولت مند، صاحب وقار اور پنچایتوں میں اپنی بات منوانے والا تھا۔ اس کی رائے میں یہ شادی ضرور ہونی چاہیے تھی۔ اس نے سدین کو پرچون کے کاروبار کے لئے روپیہ دیا تھا اور بیٹھ والے میں دوکان واجبی کرایے پر دی تھی۔ یوں سدین مرفہ الحال ہوگیا تھا۔
وید جوتشی کی منطق اوروں سے علیحدہ تھی۔ وہ کہتا تھا کہ جب اس نے اشکل یکشش کا نام رکھا تھا۔ اسے علم جوتش سے اس وقت بھی پتہ تھا کہ ان دونوں کا بیاہ ہوگا۔ اسی لئے اس نے ان دونوں کے نام ملتے جلتے رکھے تھے۔
وید نے ان دونوں کی جنم کنڈلیاں بھی دیکھی تھیں۔ ان دونوں کو اس نے منحوس بتایا تھا جس کی وجہ محض ایک روپے کی عدم وصولی تھی۔ اب جو اس سے اس نحوست کی بابت پوچھا گیا تو وہ بولا میں نے ایسا اس لئے کہا تھا کہ اگنی ہوتریوں اور گھانیوں میں بیاہ نہیں ہوا کرتا۔ جو ان دونوں کا بیاہ نہ ہوا تو سارے داشی کشٹ میں آجائیں گے۔ بیاہے گئے تو کلیان ہوجائے گا۔

جات پات دیکھے نہ کو
ہر کو جپے سو ہر کا ہو

وید کی منطق گاؤں والوں کو کافی بھاری معلوم ہوئی۔ اور سب سے زیادہ وہ اسی سے متاثر ہوئے۔
تو گاؤں کے ماحول، کھیرے کے اخلاص، غوثے نمبردار کے روپے اور وید

جو تنشی کے انتباہ نے ذات پات کی تاریخی دیواریں توڑ کر رکھ دیں۔ ایک کم قدر گھاٹیے برہمن کا بیاہ گراں قدر راگتی ہوتری لڑکی سے طے پا گیا اور انتظامات شروع ہو گئے۔

اب جو شکل کی شادی طے ہو گئی تھی تو اس نے کھیرے کو نور رے پل پر بلایا جس کے جنوب میں برسات سے جلی ہوئی فالیزوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ شمال میں ہندو راجپوتوں کا دیسی آموں کا باغ تھا جس میں گھو گھو رہتے تھے۔ یہ جگہ سنسان تھی۔ کھیرا یہاں بعد مغرب پہنچ کر خوشی کی سیٹیاں بجاتا پھر رہا تھا۔

اجڑی ہوئی فالیزوں میں گیدڑ شاید اس لئے واویلا کر رہے تھے کہ جب یہاں پھل تھا تو مالک لاٹھیاں لے کر ان کے پیچھے دوڑتے تھے اور کتوں کو ان پر چھوڑا جاتا تھا جو انہیں دور دور تک کھدیڑ کر آتے تھے۔ اب جو یہاں جلی ہوئی بیلوں کے سوا کچھ نہ تھا، تو انہیں یہاں آنے کا یارا ہوا تھا۔ دیسی آموں میں گھو گھو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔

جب غروب کو گھنٹہ بھر ہو گیا، تو شکل بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے کھیرے کو دیکھ لیا، اور ایک جھاڑی میں دبکی بار خود بھی سیٹیاں بجانے لگی۔ اس کی سیٹیاں سن کر کھیرا خاموش ہو گیا تو وہ جھاڑی میں سے بولی "سیٹی باج ہو، ہو، ہو"
کھیرا اس آواز پر سن سا ہو گیا۔ اب شکل نے آواز دی "پرو پکار، ہو، ہو، ہو"،
پھر وہ ٹلک، ٹلک کر مدھر پتا دکھاتے ہوئے، کاے تیتر کی ڈرنا، گی، سج وسج اور قدم بازی کے ساتھ جھاڑی سے باہر نکل آئی۔ یہ دونوں آنکھوں

ریت تلے پہنچ گئے ۔ مشرق کی طرف نویں در میں ٹخنے بھگو پانی جھر جھر ارہا تھا ۔ اور پُل کی چھت میں چوڑے گاٹروں پر کبوتر، اور چمگادڑیں چیں چیں کرتے ماں باپ سے ضد کرتے ہوئے ان کے بچے بول رہے تھے ۔

یہ سردیوں کی ایک چاندنی رات تھی ۔ فضا میں گویا دودھیا موتی چور گھلا ہوا تھا ۔ پل کی گہری چھائیں سفید ریت پر پڑ رہی تھی ، نور سے اوپر جو جھاؤ جھنکار ، جھاڑ جھنگ تھا ۔ اس میں جھینگر جھینگریاں شور مچا رہی تھیں ۔ امرودوں کے باغ میں رکھوالا چمگادڑوں کو " ہا ، ہا ، ہا " کر کے بھگا رہا تھا ۔ چھوٹی چھوٹی کنکریوں پڑے کنستر بھی رہ رہ کر کھنچ کھنچ کر بجائے جا رہے تھے ۔ شمال مشرق ڈھاک پر قطار میں کھڑے ہوئے جھومتے کا لا خف فصیل معلوم ہو رہے تھے ۔ ان کے اوپر چاند نکلا ہوا تھا ۔ چونے کی بھٹی پر کام کرنے والی کنبی لڑکیاں ڈھولک اور بیلے پر فراغت کے گیت گا کر گھونگھرو پہنے ہوئے ناچ رہی تھیں ۔ مگر سب سے زیادہ شکل پکشش کی حشمت اور ناز بھاؤ قابلِ دید تھا ۔ جو کھیرے کے ساتھ چہل بازی کا جھگڑا باندھ رہی تھی :

شکل :۔ مارے بھلا میں تجھے کیوں بلایا ہے ۔

کھیرا :۔ ملن کھاطر ۔

شکل :۔ ملن کھاطر ، نہیں ارے پرچکار ! بات کرن کھاطر ۔ تیرا میرا بیاہ پنچوں نے پکا کر دیا ؟ "

کھیرا :۔ کیوں کیا میں راجی نہیں ۔

شکل :۔ میرا وچن تھا جو سے مانگے گا ، وہ ملے گی ۔ پھر راجی کیوں نہ ہوتی ؟

میں وچن پورا کروں گی۔ پسپج پوچھیں تو میری نیت نئیں ہے سارے بکھیڑے!
اس جھمیلے میں نہ پڑ۔ اپنی سنک چھوڑ دے۔"

کھیرا :- تیں اسے سنک کہے ہے؟

شگل :- تو تیں میرے گیل بیاہ ضرور کراوے گا۔"

کھیرا :- ضرور

شگل :- ارے کھیرے نہ کر، نہ کر۔ جو میں لنگڑی، لولی، لولی، گونگی، اندھی نکلی؟

کھیرا :- تیں ایسی کیوں ہوتی تیری چال گوئے نمبردار کی قدم باج بچھیری کی طروں ہے۔

شگل :- کھیرتو بند کر۔ تیں سمجھے لنگڑی، لولی، لولی، گونگی، اندھی، اور کھبر نئیں کیا کیا ہوں۔ بس ست عیبی ہوں۔ میں تیرے قابل نئیں، تیں میرے گیل بیاہ کرکے کیا لے گا۔ اسے بیاہ نہ کر، نہ کر، نہ کر .... یوں ہی سنتے رہیں گے۔

کھیرا :- یہ باپ ملاپ اور کو کرم ہے۔ تیں چاہے ست عیبی ہو، چاہے سو عیبی، میں تیرے ساتھ ضرور بیاہ کراؤں گا۔

شگل :- چاہے کیسی ہی ہوں؟

کھیرا :- ہاں

شگل :- کیوں؟

کھیرا :- میں تجھے اپنے پالے میں لینا چاہوں ہوں۔

شکل :- سنچت ہو کے سن پچھتاوے گا۔ کہے گا سالگرام سے چکی بھلی جو دے آٹا پیس۔ کھالی شکل پہ نئیں جایا کرتے۔ تیں کپسلا گینی تو دیکھی ہے، پہ جیہدا دودھ نہ دے تو کس کرم کی۔ ابھی کچھ نئیں بگڑا۔ نیت بدل دے ...... گدھ گھاٹیئے کے......

کھیرا :- تیری میری راس ملی ہوئی ہے ہماری اچھی جوڑی بنے گی۔ میں نیت نئیں بدلوں گا۔

شکل :- جو کوئی بات بیاہ پیچھے معلوم پڑی؟

کھیرا : ملوم پڑن دے۔

شکل :- رنج کرے گا۔

کھیرا :- تیرے ہوتے ہوئے رنج کہاں۔

شکل :- تو نیں اللجھپ نئیں، میں سدا سہاگن رہوں گی

کھیرا :- اور میں فوندہ باسدھ رہوں گا۔ تیں گوری ہے میں کالا۔ تیں سدی ہے میں بدی ائیں شکل ہے............ میں کرشن، ہماری جان ایک ہے پکش دو۔

شکل :- وید جوتشی نے تیری میری کرم ریکھ دیکھی تھی، کہے تھا بڑی انبجھ ہے:-

کھیرا :- او تو روپے جو نئیں ملے تھے۔ ماٹھر، ماٹھو جھنڈر۔

شکل :- دہلتے ہوئے، اچھا سے بدزان تیں مجھے ننگ بیری کیوں کہا تھا:-

کھیرا :- چرانے کو ۔

شکل :- اب میری طرف کھوتوں کی طرح کیوں دیکھ رہا ہے ۔ مجھے یوں نہ دیکھ ۔

کھیرا :- بے میں پیٹھ پھیر لی ۔ ستونتی، انگونتی، روپ ونتی کو نئیں دیکھوں گا۔ ساتھ ساتھ جھروکوں پہ نکلے چاند کو دیکھوں گا ۔

شکل :- منہ میری طرف پھیرے رہ ۔ مجھے یوں دیکھ جس طرح میں تجھے دیکھوں ہوں ۔

کھیرا :- ~ تیری نظراں ہیں پھیر پھندی ۔

کنبی لڑکیوں کے یہ بول سن کر شکل کو ہنسی آ گئی ۔ پھر ان کی نظریں بے تکلفی کے ساتھ پہلی بار ملیں، نظروں کے ساتھ دل بھی مل گئے ۔ لیکن ان کے جسم کا کوئی حصہ حتٰی کہ ہاتھ تک ایک دوسرے کے نہ ملے ۔

چونے کی کٹھی پر بیٹھی لڑکیاں اب بھی گا رہی تھیں ....

میری نجریں ہیں پھیر پھندی
بچ کے رہیو !!!!!!

اور اس دھن کے زیر و بم پر شکل اپنی پھیر پھندی بھری آنکھیں پٹکانے لگی، ساتھ کے ساتھ کھیرا اس کی انگشت شہادت، کو بھی تال کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ گویا خود رقص کرتے ہوئے انگشت افشانی کر رہی تھی ۔ یہ دونوں آٹھویں در میں جس کے نزدیک نویں میں پانی بہہ رہا تھا، ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے چکوا چکوی پاس پاس کھڑے ہوں، یا رادھا کرشن ان دونوں کے دل میں خوشیوں

کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

معلوم نہیں یہ کب تک مجالست کرتے رہتے کہ جمبوعوں کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی دیوانہ قہقہہ لگا رہا ہو۔ ساتھ گھو گھو بھی بول رہے تھے۔ نوورہ پر سے کوئی ٹرک مال سے بھرا ہوا گذر رہا تھا جس کی ٹکر تیز رفتار لاری سے ہوئی اور بڑا دھماکہ ہوا۔ جبھی ان کے پاس ہی ساتویں در میں سے تین چار گیدڑ بھاگتے ہوئے گزرے۔ ایک لگڑ بھگڑ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ دیوانہ کے قہقہے ایسی آواز اسی کی تھی۔ آسمان پر ایک بڑا تارا ٹوٹا تھا جس سے خوب روشنی ہو گئی تھی۔

یہ نامساعد حالات دیکھ کر جی کی پوری کے یہ دونوں ماسی اپنے گھر کو چل دیے۔

۷

جب کاتک چڑھا تو مکل کیش اور سوبس لال نے آکاس دیئے جلائے۔ یہ وہ چراغ ہوتے ہیں جو بہند و بانس اور بلیوں پر کاتک میں ٹانگتے ہیں کہ بارش ہو گئی.... گرام واسیوں نے رات کے لئے ہلکی رضائیاں نکالیں، کپاس کے لوسرے اُتر رہے تھے۔ روئی اوٹنے کی دستی چرخیاں چیخ رہی تھیں۔ دھنیوں کا کاروبار چمک گیا تھا۔ برسات کے دھبے ختم ہو کر آسمان پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ تلاؤ کے دودھیا سنگھاڑے اور نیا گڑ چل گیا تھا۔ رتیاں پک کر بیلوں تلے گر رہی تھیں۔ گاؤں دروازے پوال کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جس بھیڑوں کو پھاگن چیت میں مونڈا تھا اب ان کی اون بڑھ گئی تھی۔

کڑم دھم، کڑم دھم کڑم دھم کڑم دھم۔ شکل اور کھیرا دھان تیرس کے
ڈھول ڈھمکے کے ساتھ بیاہے گئے۔ سارا گاؤں ہندو مسلمان، اس
خوشی میں شریک تھا۔ شادی کی شبھ لگن وید جی جوتشی جی نے نکالی تھی۔
جو سمجھتا تھا کہ شادی کا کارن اصل میں وہی ہے۔ ہندوؤں کا تہوار دھان
تیرس کاتک کی تیرھویں کو ہوتا ہے اور یہی ساعت شادی کی نکلی تو یہ
بیاہ بہت مبارک سمجھا گیا۔ نمبردار نے دولہن کے لئے نگل مالا اور
دولہا کے لئے موتیوں کا سہرا بھیجے تھے۔ وید جوتشی نے دولہن کو بیر
بہوٹی چڑھائی تھی۔

سہاگ رات کی صبح تھی جب کھیرا نہار منہ کہیں چلا گیا۔ اس کی ماں
جیسی روٹی پر مکھن، پھلوری پر کھیر، ٹھیکری میں اچار اور مٹھائی لئے بیٹھی تھی کہ اس کا
بیٹا دستی تلکے پر نہا دھو کر ناشتہ کرے گا۔ وہ بھوکے تھے بھی یہی کچھ بھیج رہی تھی
لیکن اچھا خاصا دوپہر ہو گیا اور کھیرے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ ماں نے جانا بیٹا ہی
للچا رہا ہے جو اب تک اندر ہی بیٹھا ہے۔ جھنجھلا کر ماں نے آواز دی "ارے
کھیرے، بھیا کہاں ہے۔" کچھ توقف کے بعد اس نے شکل کو پکارا "رونا دولی
رونا دولی" اس نے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ بہو کی ایک ہچکی
نے ماں کو ڈرا دیا۔ وہ دروازے کے پاس آ کر چلائی "رونا دولی دوار کھول" دوار
تو پہلے ہی بند نہیں تھا کیونکہ کھیرے کے جانے کے بعد شکل بیکش تو اپنی جگہ
سے اٹھی بھی نہیں تھی۔۔۔ بہو کی ہچکیاں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ساس
اندر چلی آئی۔

بستر اب بھی جوں کا توں بنا ٹھنا سا جھول تھا، عود سوز نے کوٹھے
میں باسی خوشبو پھیلائی ہوئی تھی۔ نوشے کا سہرا کھونٹی پر ٹنگا ہوا تھا، نوشی گہنا
پہنے ہوئے تھی۔ کبیر انہیں چلا گیا تھا۔ بہو سے روٹھ کے؟ اسے پسند نہیں
آئی تھی؟ لیکن یہ بڑے چہ چلوں کا بیاہ تھا، اور پھر رات تک ہشاش بشاش
تھا۔ اب بہو سہاگ اتری محروم بے حشمت انجھولا گھائی سی منہدم، اور
چاک گریباں بیٹھی اپنے ننگے پیروں کو دیکھ رہی تھی جو آنسوؤں سے بھیگ
رہے تھے، بھگوان نے جو اس کے حسن کو چیٹ پٹا بنانے کے لئے آنکھوں
میں پھند کی چھوکن دی تھی، اب وہاں نہ اس کا سیٹھا پن آ گیا تھا۔ مان فق
ہو گئی تھی۔

بہو کو تو کبیر سے نے بہت پسند کیا تھا لیکن وہ واقعی اس کے
قابل نہ تھی، کبیر سے نے دیکھا تھا کہ بہو کا حصہ خاص ایسا ہی سپاٹ ہے جیسا
اس کا ننگا پاؤں۔ مثل ناف یہاں ایک نشان ضرور تھا اور بس۔ یہ نشان
اس موئے سے کے ناک کے جننا ہو گا جس سے لوریاں سی جاتی ہیں۔ پھر وہ مرد
قابل کیسے ہوتی۔

اگر بچپن میں اس کا اپریشن ہو جاتا تو وہ اس حالت کو نہ پہنچتی، اور
جس طرح سے دولہا دلہن کے دل و نظر ہو مسے، پر ملے تھے اسی
طرح سے ان کے جسم بھی جائز ملاپ میں ایک دوسرے سے ملتے۔
ان کے جسم ایک دوسرے سے کیا ملتے ان میں قدرت نے اب تو
جنم پھٹا، ڈال دیا تھا۔

شکل سوچ رہی تھی میرا وچن تھا جو شے وہ مانگے گا اسے ملے گی میرا وچن سنپورن ہوا پھر وہ دل ہی دل میں بین کرنے لگی۔

راجہ کس کے پاہنے

جوگی کس کے میت

اگر کوئی اتنا بڑا سرونا ہوتا جس میں اس کی گردن اور سر آجاتے تو شکل کو اس میں اپنی گردن ڈال کر گنڈیری اور ساچار ی اببا کی طرح کٹوا ڈالنے میں عذر نہ ہوتا اور کھیرے کی نظر میں شاید اسے پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑا کر کے نیچے پٹکنی دے دینی چاہیے تھی یا پارسیوں کے مینار خاموشی پہ بٹھا دینا چاہیے تھا تاکہ اسے چیل گدھ کھا جاتے۔

کھیرا اور یہ لڑکی اب بھی ایک دوسرے سے لودرہ کی طرح جڑے رہتے تو یہ پاپ بیوہار نہ ہوتا۔ جب اسے شادی سے ناامیدی ہو گئی تھی تب بھی اس نے شکل کو موت کے منہ سے بچا یا تھا۔ کیا وہ اس کے لئے دائمی تجرد اختیار کر سکتا تھا؟ کیا کھیرا اور شکل جوگن اور جوگی کی طرح نہیں رہ سکتے تھے؟ کیا اس کی موجودہ سنگت ہی لایعنی تھی؟۔

کھیرے کی ماں اپنے شوہر کے پاس گئی۔ جو اُسارے میں مونڈھا بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کی جوتی پر جوتی چڑھی ہوئی تھی جو سفر کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے.... ابابیلیں بولتی ہوئی اپنے گھونسلوں میں آ جا رہی تھیں۔ چھجے کے سامنے کھڑے ہوئے ڈیک کے پتے خشک ہو کر ہوا میں دھمار ہے تھے۔ نیبو میاں سوکھتی جا رہی تھیں، ایک ہمیشہ کو دکر چلنے والی گوریا جس کا کام اُٹھتے

بیٹھتے، کھاتے پیتے ناچنا کودنا تھا، ٹہنی پر بیٹھی ناچ کود رہی تھی۔ شروع شروع میں گھونسلہ چھوڑ کر یہ ماں باپ کی معیت میں کبھی خود چگتی کبھی ان سے چونچ لگا لیتی پھرتی تھی۔ اس وقت یہ ناچتی کودتی نہ تھی۔ پھر جب اسے آزادی کا پروانہ مل گیا اور والدین کی ولایت ختم ہو گئی تو اس نے ناچنا کودنا شروع کر دیا تھا فینکل بھی شادی کے بعد اب والدین کی ولایت میں نہ تھی اسے آزادی کا پروانہ مل گیا تھا۔ وہ چاہے جتنا ناچتی کودتی لیکن کھیر اڑا سے جیتے جی وہ دھوا چھوڑ گیا تھا۔

کیکر پر خشک پھوا میں جھنجھنا رہے تھے۔ لیکن یہ بھی جھولا جھولنے والوں سے اسی طرح خالی تھے جس طرح شکل کا حجلۂ عروسی دلہا سے۔۔۔

سامنے سے غوشہ قدم بانا لپتی پر چلا آ رہا تھا۔ جب بچھیری پاس سے گذرنے لگی تو گردھر گھاٹیا ہڑ بڑا کر جیسے اٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھے اور سلام کیا۔

غوشہ گذر گیا تو کھیرے کی ماں نے اسارے میں آ کر سفر کے شگون جوتی پر جوتی چڑھی، الگ کر کے کھیرے کی خبر سنائی۔ گردھر کے منہ سے ایک بول بھی نہ نکلا۔

دو تین دن تو گردھر گھاٹیا سرتیوں کی طرح کھیرے کو ڈھونڈتا پھرتا رہا۔ لیکن اسے کوئی سن گن نہ ملی۔۔۔۔۔ پھر اس نے گھر سے ایک کمبل اٹھایا، ایک کوٹ کی لٹیا اور سوت کی ڈوری جو اس نے کمبل پہ کھینچی ہوئی تھی اور لٹیا کو اس میں باندھ کر باہر لٹکایا ہوا تھا۔ اس سے

وِشاشدوں پوچھے بغیر مندر میں گھنٹے بجنے سے قبل کوچ پر کمر باندھ لی تھی۔

جب وہ نودتھے پر پہنچا تھا تو پیچھے سے ٹاپوں کی آواز آئی۔ غوثہ ابلق پر اپنا مقیم ماجرہ والا باغ دیکھنے جا رہا تھا۔ گردھر گھاٹیے نے گڑے سے اتر کر درخت کی آڑ لے لی۔ نودرہ پار کر کے وہ پکی سڑک کی بجائے اس کچی سڑک پر ہو لیا جس کے دونوں طرف کسانوں نے مقوہر لگائے ہوئے تھے۔

جس دن سے کھیرے کی نوشی آئی تھی۔ گردھر گھاٹیا باہر اسارے میں سونے لگا تھا۔ اس کی بیوی ناشتہ تیار کر لیتی تو یہ خود ہی اندر آ کر کھا لیتا تھا۔ آج جو ناتھو کو دیر ہوئی تو کھیرے کی ماں کا ماتھا ٹھنکنے لگا، وہ اوکلی باؤلی سی اسارے کی طرف چلی اسے جوتی پر جوتی کا خیال آ رہا تھا۔ چارپائی خالی تھی۔ اُسے خود بخود رونا آ گیا۔ وہ تھوڑی دیر چارپائی پہ بیٹھی تھی کہ ڈیک تلے ایک تنہا مکھنا مرغا دانا پا کر مرغیوں کو ٹک ٹک کر کے بلاتا نظر آیا وہ کچھ دیر تک مکھنے مرغے کو دیکھتی رہی اس کا دل کڑھ گیا اور وہ اپنے ناتھو کو ڈھونڈنے کے لئے ماتا دیوی کے گھاٹ کی طرف چل دی اس نے جھانوں سے گردھر گھاٹیے کی بابت پوچھا پاچھا پھر وہ ناگا دیوی کے ٹیلے پر کھڑی ہو گئی۔ لوگ تانگوں میں اور پیدل آ جا رہے تھے، دوپہر ہوئے وہ گھر واپس ہوئی تو دیکھا کہ کمبل اور لٹیا تھوڑی غائب ہیں۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ بھی انا تھر رہ گئی ہے۔

آج سے ساس بہو نے اپنے بالوں کی پٹیاں باندھ لیں تھیں، یعنی مانگ

مٹا کر بال پیچھے الٹ لئے تھے جو ہندو عورتوں میں سوگ کا نشان تھا۔

جب لوگ وید جی جوتشی جی سے جا جا پوچھتے "جوتشی جی، تم نے اس بیاہ کی شبھ لگن کا ڈھی تھی، پھر یہ کیا ہو گیا؟" تو وہ جواب دیتا "تھوڑے دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر اس سے سوال کرتے "تمہاری پوتھی کیا کہے ہے کب تک ٹھیک ہو جا گا؟" تو وہ بڑبڑا کر کہتا! "شوباش لال نے میرا نام بگاڑا تھا، میں نے تو اس کی بہن سے بدلا اتارا ہے۔"

یہ بات جب گاؤں میں پھیلی تو غوثا نمبردار لاٹھی لے کر وید کو اس کے ویدک اودشالہ میں بیٹھ کے دن مارنے آیا۔ اس نے اپنی جان یہ کہہ کر بچائی "بھلا نمبردار جی جو میں ایسا کرتا تو شکلی بکشی کو بیر بندھنی کیوں چڑھاتا؟"

ترلوکی

کیکروں والے ریڑے پر پیڑ پڑے ہوئے تھے۔ یہ ریڑا شکل میں گویا ہاتھی کی پیٹھ تھی۔ اس کے ملحق پورب کی جانب کافی گہرائی میں برساتی ندی کا ریت اس طرح چمک رہا تھا جیسے دھوبی گھاٹ پر سوکھتے ہوئے سفید کپڑے۔ کیونکہ دھوپ تیز تھی۔ دھوبی گھاٹ اس جگہ واقع تھا جہاں برساتی ندی متعلق نہر کو عبور کر کے غرب کی جانب بہتی ہوئی چلی گئی ہے اور اس کے دونوں کنارے پولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ توڑیئے لوبیئے کے کھیتوں اور بیلے سے شکاریوں کے دُو کارے ہوئے خرگوش جب ان پولوں میں پہنچ جاتے تو اُن کا پانی تنا ہی محال ہو جاتا جتنا کسی اندھیرے گنجان اور گھاؤ گھپ جنگل میں چھپے ہوئے لال کا ڈھونڈنا۔

تو ایسی دوپہری میں جب کہ ریڑے پر پڑے ہوئے مرڈھ اور جنیوں کے دانے خود بخود چٹک رہے تھے اور بارہ ماسی بیلداروں کی چوکی کے پاس اکھڑے ہوئے بہت سے سیملوں پر بیٹھے ٹونیاں اور لمبیر گرمی کے سبب زرد اور سرخ چونچیں کھولے وظیفہ خوانوں کی مانند اپنی مدّ ی زبانیں ہلاتے ہوئے

سانس لے رہے تھے۔ موضع ڈھک ذئی کو نوبالا سلمی ستارہ کپھنا گھڑ، کنول روپی، چنچلیا لڑکی زرلوکی اپنی کپلا گائے کو نہر پہ پانی پلانے کے لئے چلی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے سہ دری کے گول ستونوں کے پاس کھڑے ہوئے دوپہر بیٹے گے پھولوں اور گملے میں پرورش کی ہوئی تلسی میں پانی ڈالا۔ تو اس کی ماں بولی "اس بکھت ناں پانی دیا کرتے یہ جل جان گے"۔ لیکن زرلوکی کہاں مانتی تھی اس نے تو انہیں جی جان سے پالا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح رنگین دھبے والی کپلا گائے کو دوپہری میں پیاس لگتی ہے ایسے ہی انہیں بھی لگتی ہوگی۔

یہ لڑکی بدن میں دودھ جلنے پر پڑی ہوئی لمبی اور تیلی ترلوکی ایسی تھی۔ اس میں نہر پار کھڑے ہوئے گوبند باغ کے آموں سے زیادہ چاشنی، ذائقہ اور مٹھاس تھا۔ اتنی بہار بسنت میں سرسوں کے زرد پھولوں بھرے سونے پر نہ ہوگی جو اس پر تھی۔ گاؤں میں شمال کی طرف پھیلے ہوئے پیلو، کریر اور تیندو کے جنگل میں کریر پہ سجا ہوا نگوں ڈیلا خوش رنگی میں زرلوکی کے اچھوتے اُجیت اور گورے گورے گالوں کی ریس نہیں کر سکتا ہوگا جو وہ انجیری رنگ کا برقع پہنے ہوئے نقاب اٹھا کر ہجوم عشاق سے کہہ دیتی "زمانے کو شیریں کے لئے کوہ بے ستون سے نہر نکالی تھی۔ آپ چاند سے نکال لاؤ تو تب جانوں"۔ تو مخلوق اس دھن میں دیوانی ہو جاتی کہ زمین پر چاند کی خشک بے آباد پہاڑیوں سے کیسے اتنا پانی اتارا جائے گا۔ کہ نہر جاری ہو سکے۔

ترلوکی کے ساتھ اس کی جھبری کتیا بھی جانے لگی تو اس کے باپ نے
جھبری کو ڈیوڑھی کے آگے کمر کوٹ میں زنجیر سے باندھ دیا۔ ترلوکی نے
لمبی دھاریوں کا چست سا پاجامہ بسنتی رنگ کی سادہ کرتی اور کچھ کچھ آکاشی
دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں چاندی کے چھوٹے چھوٹے چوکڑے تھے۔
جن میں دو دو لاجوردی موتی لہرا رہے تھے اس کے پاس سوائے ان چوکڑوں
کے کوئی گہنا نہ تھا۔

اُدھر مالک گوبند باغ کا لاڈلا سرنام بھی اپنی سبز رنگ گھوڑی کو نہر پر پانی پلانے
کیلئے نکلا تھا۔ اُس کے پاؤں میں دیسی جوتی تھی اور بائیں کان کی لو میں
سونے کا چکدار بھاری حلقہ۔ اس حلقہ کے مقابل ترلوکی کے چوکڑے اس کا
واحد زیور، مالیت میں پاسنگ تک نہیں تھے۔ وہ ننگی پیٹھ پر سوار تھا اور گھوڑی
کے ڈھانٹی رسی ہوئی تھی۔ جب وہ کمر کوٹ کے پاس سے گزرنے لگا۔ تو
جھبری اس کی طرف منہ کر کے بھونکتے ہوئے زنجیر تڑانے لگی۔ ترلوکی نے اس
کی نیلی دھوتی میں سے کھلی ہوئی کجل گوں پنڈلیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کتیا
کو پچکارنا شروع کر دیا۔ اس کی پنڈلیاں گیتوں والی پچھی کی پنڈلیوں ایسی گول
گول تھیں اور وہ ایسا چھریری معلوم ہو رہا تھا جیسے سوئمبر میں پرتھوی راج سے
بھی زیادہ پسند کرتے لیکن باوجود چھریری سا دکھائی دینے کے وہ ایسا کول
کومل ملائم تھا جیسے وریا کے بستر میں سلائیں۔ اسی لئے ترلوکی نے جھبری
اس پر تقریب گفتار کی طرح ڈالنے کے لئے پچکاری تھی۔

سرنام کے گھر آٹھ بیلوں کی کھیتی ہوتی تھی۔ اس کے باپ اور تایا کا

کاروبار مشترکہ تھا۔ وہ دو سو بیگھے خام نہری اراضی کے مالک تھے۔ جس میں سے ...... پچیس بیگھے کا گوہند باغ بھی تھا۔ دیہاتی علاقے میں انہیں سرمایہ دار تصور کرتے تھے۔ ہرنام کے تایا گھاسی رام کی بیوی مرگئی تو وہ محض غم غلط کرنے کے لئے لام پر چلا گیا تھا۔ واپسی پر اس کی حالت یہ تھی کہ وہ سمجھتا ہم چو ما دیگرے نیست۔ بوجہ بے اولاد ہونے کے اس کا وارث اس کا اکلوتا بھتیجا ہرنام تھا۔

گھر کے سب آدمی گھاسی رام کی بڑی طلو تبوہ کرتے تھے اور گو وہ پلٹن میں کچھ برس صرف بطور سپاہی کے رہا تھا لیکن اپنے آپ سپہ سالار اعظم کی طرح فوجی چالوں، رسد رسانی، خطوط جنگ کا ماہر سمجھتا تھا۔ اس کی چال اب بھی فوجی سی تھی اور وہ ذرا سینہ نکال کر کچھ ہاتھ جھٹکتے ہوئے چلا کرتا تھا۔ جب وہ کھڑا ہوتا تو پریڈ کے اٹنشن سپاہی کی طرح سے ایڑیاں ملا لیتا اور آگے سے پاؤں کھلے ہوتے۔ خواہ بیاہ شادی ہو یا کسی افسر سے ملاقات وہ ایسے موقعوں پر اپنی وردی کا خاکی کوٹ ڈاٹ لیا کرتا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے کرسی دار مونڈھے پر بیٹھا ہوا کبھی تو وہ کرنل کارڈ کے ذکر کرتا۔ کبھی لال کرتی بازار کے، کبھی گورنوں کے تو کبھی گورکھوں کے بعض مرتبہ وہ اپنے دیسی جوتے کی ایڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح مارتا جس طرح فوجی اٹنشن ہوتے ہوئے مارتے ہیں۔

قانون گو یا تھانیدار ڈھک وئی میں آتے تو یہ ان کے برابر بیٹھتا۔ ایک مرتبہ ڈپٹی کمشنر نزدیکی قصبہ مہور یہ میں آیا تو اس نے ضلع افسر کے لئے

جانب شمال ٹیک والی ٹملیک کے کنارے گوچر میں تمبو لگوائے۔ گوچر سے ملے
ہوئے پیلو، کریر اور تھینڈرو کے جنگل میں اسے چیتل، سانبھر کا شکار کھلایا
جس کے صلے میں گھاسی رام کو ایک نالی کارتوسی بندوق کا لائسنس ملا۔
وہ برسات کے دن تھے اور گھپ اندھیری آدھی رات جب یہ شہر
سے بندوق لے کر گاؤں میں آیا اور اس نے اپنی ٹھک دکھلانے کے لئے
بارہ ہوائی فیر کئے۔ اور دو کتوں کو چھرے مار دیئے جو اسے بھونک رہے
تھے۔ اس کی ضد کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ ہرنام کی پیدائش
کے وقت سے نہ بولا تھا کیونکہ ہرنام کے باپ نے خوشی کے ڈھول بجانے
والے بڑے بھائی سے پوچھے بغیر بلالئے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے مہمانوں
کی خاطر حلوائی سے ایک روپیہ کی مٹھائی خریدی اور جیب سے اٹھنی نکال کر پکڑانے
لگا تو دوکاندار نے آٹھ آنے اور مانگے۔ اس نے زور کے ساتھ کہا کہ یہ تو روپیہ
ہی ہے۔ دکان پر مہمان تنگ آگئے اور یہ سب کے سامنے اپنی اٹھنی کو روپیہ
ہی بتاتا رہا۔ جب لوگوں نے اٹھنی کے نیچے روپیہ رکھ کر یہ کہا کہ یہ تو چھوٹی
ہے تو تڑنے لگا میں نے روپیہ ہی دیا ہے اس میں چاندی روپیہ جتنی ہی ہے
کیونکہ یہی زیادہ چمکدار ہے اور روپیہ مدہم ہے۔ آخر حلوائی ہی چپکا ہو گیا۔ اس
کے بعد اس نے کبھی حلوائی کی دوکان سے سودا نہیں خریدا۔

نزدیکی قصبہ مہوریہ میں ایک فیشن ایبل ہوٹل کھلا تھا جس کے دروازہ پر
جالی دار کواڑ لگے ہوئے تھے۔ کہ مکھیاں اندر نہ جا سکیں۔ جیسا کہ قاعدہ ہے کہ
یہ کواڑ باہر کو کھلتے تھے۔ گاؤں میں تمام کواڑ اندر ہی کو کھلتے ہیں۔ گھاسی رام جالی دار

کواڑوں کو اندر کی طرف کھینچنے لگا اور وہ ضد دکھائی کر باوجود سمجھانے کے اسی پہ اڑا رہا کہ اندر کو ہی کھولوں گا۔ وہ انہیں توڑ تو نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں لوگ جمع ہو گئے تھے لیکن ان پہ زور سے لاٹھیاں مار کر بلا کھانا کھائے چلا گیا۔

ہر نام کے گھرانے کی وقعت اس کے تایا نے بڑھا دی تھی۔ پیپڑ لوں والے گھاٹ پار گوبند باغ بھی اسی کا لگوایا ہوا تھا۔ ملکہ بالی جس کے لئے .... اس قدیم شہر میں باغ لگوائے گئے تھے وہ ان پر اتنا نازاں ہوتی جتنا یہ، وہ اس باغ کے بے تخم امرود اور بے گٹھلی آم (جس میں گٹھلی پٹرے کاغذی بادام جتنی تھی) سرکاری افسروں کو دکھایا کرتا تھا۔ ہر نام کے باپ کی حیثیت اس کے مقابل کچھ بھی تو نہ تھی، یہ گویا اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے اپنی جنجھلاہٹ اور برتری جتاتا رہتا تھا۔ اور ہر نام کو سب لوگ گھاسی رام کا بھتیجہ (بھتیجا) کہتے تھے۔ باپ کا نام کوئی نہ لیتا تھا۔ کرسی دار مونڈھے پر کمر لگا کر بیٹھے ہوئے، پاؤں سامنے والے بے کرسی مونڈھے پر پھیلائے وہ یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

ہے سواری کو یہ لازم صبر کرنا چاہیئے
ٹھہر جائے جب یہ گاڑی تب اترنا چاہیئے

یہ شعر کسی کرایہ کی بس پر لکھے ہوئے ہوں گے

خواہ تھانیدار ہو یا ضلع افسر یہ ان کے ساتھ اس طرح ٹانگ اکڑا کر چلتا تھا جس طرح فوجی افسر کسی بڑی ہستی کو گارڈ آف آنر کا ملاحظہ کرتے

ہوئے چلا کرتے ہیں اور پیٹ سکوڑ لیتا تھا ایک مرتبہ بسوڑوں میں بارات آئی جس کے بھنڈیلے گھاسی رام کی نقل کرتے ہوئے کبھی مونہہ ٹیڑھے پر بیٹھتے کبھی جوتوں کو ایڑیاں مارتے۔ کبھی پیٹ سکوڑ کر ٹانگیں اکڑا کر چلتے اس کا پتہ کسی نے گھاسی کو بھی دیدیا۔ اس نے بھری محفل میں آکر بھنڈیلوں کو گالیاں دی تھیں اور جوتے مار سے تھے اس سے اتنی سڑ بڑی مچی تھی کہ بھنڈیلے اپنے ڈھول اور ہارمونیم چھوڑ کر بھاگ گئے اور آئندہ کوئی بھی بھنڈیلا اس گاؤں میں نہیں آتا تھا۔

گھاسی رام کی سختیاں انسانوں تک ہی محدود نہیں تھیں ان کی لپیٹ میں مویشی تک آگئے تھے اس کی بھینس نے جب دودھ دیتے ہوئے تنگ کیا تو اس نے وہ دودھ پیتا کٹڑا تو قصائیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور بھینس کو چاندطر بنا کر ہلوں میں جوتی تھی۔

ادھر نرلوکی کا دادا بھی ہرنام کے گھرانے کیطرح ہی سرمایہ دار تھا لیکن اس نے اپنی کل زمین شراب اور عورت کی علت میں ختم کردی تھی۔ نرلوکی کا باپ اب ادھا بھوکیا، بیلدار اور نرائی کرنے والا رہ گیا تھا۔ ان کے گھر کو ڈھک د ئی میں اب بھی محل کہتے تھے حالانکہ یہ محل بھانوسے نما کھوری اینٹوں کا ایک منزل مکان تھا اس کی چنائی گارے سے ہوئی تھی۔ اندرونی اور بیرونی فرش خام تھے۔ اور چھتیں بھی کچی۔ جن پر برسات میں عدم خبر گیری کی وجہ سے ہریالی کا بن پھیل جاتا تھا اور یہ ٹپکتی تھیں۔ پھر نرلوکی کا باپ کھرپے کے ساتھ ان پر سے گھاس چھیلتا اور مٹی ڈال کر تھپک سے تھپکتا۔ اکثر دفعہ جب کہ بارش کی آمد آمد

ہوتی اور ہمالہ سے اٹھا ہوا بے تحاشا بادل شمال کی جانب پھیلے ہوئے پیلو، کریا اور تیندو کے جنگل پر سے گرجتا ہوا آتا ہوتا تو تر دو کی بھی مٹی پڑی چھت پر چھپکا چلاتی ہوئی دکھائی دیتی اور گلیارے میں چلنے والے اوپر نظر کرتے تو اس کا چہرہ انہیں تازہ گنگوں ٹیلے ایسا معلوم ہوتا۔

تو جب ترلوکی نے اس کی نیلی سی دھوتی میں سے کھلی ہوئی ہمہ سُکی ابھری پنڈلیوں کی طرف آنکھ دبا کر ننگ چڑھے پن اور سیاہ چشمی سے دیکھتے ہوئے جھبڑی کو ہرنام کی طرف چمکارا تو ہرنام نے اس کی بڑی بڑی پیوندی جامن ایسی تیرہ و تار پتلیوں کی طرف دیکھا جن پر وہ گو نند باغ وار سکتا تھا لیکن گالی دیتے ہوئے بولا " دُرت تیری، کتیا تو اں میرے پاچھے کیا چھچکارے ہے۔ آپ بھونکتی ہوئی پاچھے پاچھے ہولے رہ جو میں تجھے پکڑ لیا تو میں تیرا بندھوا ہو جاؤں گا پر نیں میری سہرے ڈولے کی بیاہتا نہیں ہوگی میں تجھے اس طرح رکھوں گا جس طرح تیرے دادا نے منگنی بنجارن رکھی تھی جسے وہ وہاں سے بھگا کے لایا تھا۔ جو میں نہ پکڑا گیا تو میری مرجی تجھے جتنا چاہوں تو دل بھا نجوں۔"

ریڑھے کے پاس آ کر جہاں پیر پڑے ہوئے تھے گاؤں سے فرش والے گھاٹ پر جانے والا گونڈا اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ صرف ایک بیل گاڑی نکل سکے۔ جو کہیں دو گاڑیاں آمنے سامنے سے آ جاتیں تو ان میں سے ایک کو کافی پیچھے لے جایا جا کر گذرگاہ پیدا کی جاتی۔ یہاں دو طرف اونچی مینڈھوں پر بانسا اور مالھا کھڑا ہوا تھا اور راستے میں کوڑیالے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔

جب نرلو کی یہاں پہنچی تو ہرنام نے پیچھے سے آتے ہوئے کہا "ذرا بچ کے "ٹٹو پہ چڑھ کے جادہ مروڑاں تا آرے نکھد۔

"نکھد ہو گئی ہیں۔ ہور (اور) یہ ٹٹو نی (نہیں) مہاری کدم باج ٹرنگ گھوڑی ہے۔"

"ٹٹو ٹرنگ نی ہوتی"

جدھی (جب ہی) تو کدم باج گھوڑی نوں ٹہراتک ناہیں مجڑا۔ دھانی باندھو پھر سے ہے۔ ہور..... تیرے پیر دھرتی نوں پچکارتے جا رہے ہیں۔"

"تیں چاہتی ہو گی، میں تجھے پچکاروں، پر تو پچکارنا جدا ایک بات نہ ہوئی ہوتی۔"

"تیں ٹٹو پہ چڑھا تھا، میرے سے پہلوں (پہلے) چلا تھا۔ پھر پیچھے کیوں رہ گیا؟"

"تجی ماں سیطانی تھی، ہو ٹٹو ہی تو ہے، آہج آہج ٹولتی ہوئی چلی ہے۔ تیں یونی پہ پھتی دو (وہ) کیا بات تھی۔ جے وہ نہ ہوئی ہوتی تو ہیں تجھے ضرور پچکارتا۔ تیں دھوٹے رائے نوں جانے ہے۔"

"دھوٹے رائے کون؟"

"جو دھولا ہے، چوکیدار کا پوت۔ تیں رتو اس سے ملی ہوئی ہے۔"

یہ سنتے ہی نرلو کی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا ملیا دھار لیا

والا چست سا پاجامہ اور بینگنی رنگ کی کرتی سیرتے اتار لی ہو اور وہ ننگی بچی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس نے کئی روڑیاں پتھر اٹھا اٹھا کر سرنام کے مارے وہ ان پتھروں کا جواب صرف ان الفاظ سے دے رہا تھا کہ "للیتا جی تیری پربھا سدا بنی رہے اتنی تتی نہ ہو، اتنی تتی نہ ہو ممنہ امولال انگاری بنا لیا ہے۔ کہیں کپڑوں ماں آگ نہ لگ جا۔ مرجائی مر۔ ترلو کی پھر تیرے کی تو پچھکارتے ہوئے کنکھیوں سے کون دیکھا کرے گی"۔ ان پتھروں میں سے ایک پتھر گھوڑی کی آنکھ میں جا لگا۔ جوانی بدکی کہ بھاشی کھل گئی اور سرنام سر کے بل گرا اس کے سر میں پتھر کی دھار دار نوک چبھ گئی۔ چہرہ خون سے تر بتر ہو گیا اسے بے ہوشی طاری ہو گئی۔

جب سونی گھوڑی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی ٹلو بلہ پہنچی تو سرنام کا تایا کرسی دار مونڈھے پر جھومتا ہوا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے پاؤں ہلا کر سی کے مونڈھے پر رکھے ہوئے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ گھوڑی کا رسہ پاؤں میں گھسٹتا آ رہا ہے اور آنکھ بھی پھوٹ گئی ہے تو گھوڑی کو تھان پر باندھ کر وہ ٹلو بلہ کی ڈیوڑھی کی طرف چلا۔ جبھی چوکیدار کے لڑکے نے جلدی جلدی اور گھبراہٹ میں آکر کہا کہ سرنام ریڑے کے پاس مرا ہوا پڑا ہے۔

ترلو کی کپلا گائے کو پلا پانی پلائے ہوئے واپس لے آئی۔ پانی کی کوکھ خالی دیکھ کر اس کا باپ جھنجھلایا تو وہ سہمی ہوئی اپنی ماں کے پاس جا کر بڑی طرح رونے لگی۔ اس کی ماں نے اسے پیار کرتے ہوئے بہت پوچھنا چاہا کہ کیوں رو رہی ہے لیکن وہ بولتی ہی نہیں تھی بس سنتی جاتی تھی سنورا

دیر بعد اس نے ہچکی بھرتے ہوئے کہا کہ ہرنام نے مجھے گال (گالی) دی ہے۔ اور آگے نہیں بتلائی۔ اس کی ماں سمجھی کہ ہرنام نے ترلوکی کی عزت پر حملہ کیا ہے' اس لئے وہ بھی روتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس گئی اور اسے اتنا اکسایا کہ وہ اپنے کچھ ہمدردوں کو ساتھ لیکر ہرنام کے تایا پر چڑھ دوڑا تھا ترلوکی کے باپ نے کلہاڑی اٹھائی ہوئی تھی اور دوسرے ہمدردوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ہرنام کو چارپائی پر پڑے ہوئے لا رہے ہیں اور اس کا باپ اور ماں رو رہے ہیں۔ ہرنام کا تایا پیچھے ہی تھا اس کے آگے دم اور بے پروائی سے چل رہا تھا جیسے ریڈ کراس والے کسی زخمی سپاہی کو محاذ سے اٹھا کر لا رہے ہوں۔ انتقامی جماعت چپکے سے واپس آگئی۔

ترلوکی نے تفصیل کے ساتھ کچھ نہ بتایا تھا صرف یہی کہا تھا کہ اسے گالی دی ہے اس لئے معاملہ کی تہہ کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ ترلوکی کی ماں نے اس استفہامیہ کا جواب کہ گالی دینے کے بعد معاملہ کہاں تک پہنچا اپنی طبیعت سے پیدا کر لیا تھا کہ ہرنام نے ترلوکی کی عزت پر حملہ کیا ہے ترلوکی کے باپ نے اپنی لڑکی ہرنام کے پیچھے کتیا کو پچکارتے ہوئے کچھ سن لیا تھا اس لئے وہ یہ سمجھا کہ آخر ترلوکی کو اس طرح کہنے کی کیا حاجت تھی اور اگر ہرنام نے اسے گالی دی تو اس میں ترلوکی کا بھی قصور تھا اور عزت پر حملہ کرنے کا قصہ ایک فضول ڈھونگ ہے۔ وہ ٹھنڈا ہو گیا اور سہولیت میں آ کر گائے کو تسلے میں پانی پلانے لگا۔

۲

قصبہ مہوریہ کے چھوٹے تحصیل ہسپتال سے ڈاکٹر کوئی نصف شب پہنچا۔ ہرنام کو ابھی تک غشی طاری تھی۔ اس کے دماغ کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ اس کے جینے کی امیدیں بہی سی لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اس کی مرہم پٹی کر کے چلا گیا اور دوائی بھی دے دی پھر اس کا منہ کھول کر مشکل سے حلق تک پہنچائی گئی۔ وہ اگلے دن بھی بے ہوش پڑا رہا اور ڈاکٹر اب تک اس کی زندگی کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آج مہوریہ سے سلوتری بھی آیا تھا۔ جس نے آخری فیصلہ یہ دیا تھا کہ گھوڑی کی آنکھ ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔ چوتھائی رات گئے ہرنام نے پانی مانگا تو ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق کچھ آس سی بندھ گئی۔ پھر اس نے خود ہی بلا پوچھے اٹکتے ہوئے کہا کہ اس کی گھوڑی ریڑے کے نزدیک تراوکی کی کتیا نے بھڑکائی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ تلے گر گیا۔ یہ کہتے ہی اس پر پہلے سے بھی زیادہ غشی طاری ہو گئی اور وہ پانی بھی پی نہ سکا۔

یہ سن کر کہ اس کے بھتیجے کی تکلیف کا باعث کتیا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی قدم باز گھوڑی یک چشم رہ جائے گی۔ ہرنام کے تایا کو سخت غصہ آیا۔ وہ اپنے بھتیجے کی موت اور شام سنگھ لچھیا کو سنگین چرخی رائفل کی طرح سے لے کر وہ تراوکی کی ڈیوڑھی کے کواڑ بند تھے اور اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ وہ جا کر کواڑ دھڑ دھڑانے لگا۔ رسہ دوڑ سی شے آ گر۔ گلی میں دوڑ پڑا

سے ذرا دور برآمدے میں بیچ والے پلنگ پر زرلوکی اور دونوں جانب والی
چارپائیوں پر اُس کی ماں اور باپ سو رہے تھے۔ دیہات میں گویا لڑکیوں
کی حفاظت کے لیے اسی طرح بیچ میں سلانے کا رواج ہے۔ کواڑ دل
کے پیٹے جانے پر تینوں جاگ گئے۔ کنڈی جو تھوڑی ہوئی تھی تو ہیبت ناک
حد تک کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ زرلوکی کے دروازے پر آدھا لگا ہوا تیغ
تھا۔ زرلوکی اور اس کے ماں باپ ضیق میں تھے لیکن وہ [illegible] نہ کر سکتے
تھے۔ زرلوکی جان بچانے کے لیے کوٹھے پر چڑھ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ سرزام
نے اسے بتا دیا ہے۔ کھڑکی کی آنکھ اس نے پکڑی جس سے دو سر کے
بل نکلے آ رہا۔ وہ کوٹھے پر چھپی ہوئی سرزام کے تایا اور [illegible] کو اس طرح دیکھ
رہی تھی جس طرح غدر ۱۸۵۷ء کے دنوں میں محاصرہ شدہ انگریز لکھنؤ ریذیڈنسی
سے حملہ آور باغیوں کو [illegible] دیکھ رہے ہوں۔ اندھیرے میں کچھ
نظر نہیں آ رہا تھا ورنہ دیکھنے والے دیکھتے کہ اس کی پتلیاں ان کالی کھجوروں
سے بھی اول تھیں جو [illegible] نشانوں کے نیلے
گچھوں میں لٹک رہی ہوں۔

آخر جب دروازہ بھونچال کی حالت میں آ کر گرنے ہی لگا تو زرلوکی کے
باپ نے کنڈی کھول دی۔ گتھیا سرزام کے تایا کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ سابق فوجی
مٹھیا لیے فوجی طریقہ پر اس کے خلاف جارحانہ کارروائی کرتا ہوا اندر تب
کرنے لگا۔ زرلوکی کوٹھے کے اوپر سے چھپے ہوئے اور سہمے ہوئے
اور اس کے ماں باپ نیچے کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان میں

سے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ اسے روک سکیں۔ وہ بلا سبب بتائے کتیا کا تعاقب کر رہا تھا پھر اس نے اپنی فوجی اپروچ دکھاتے ہوئے گھیرا دے کر دو پہر بیٹے کے پھوپھوں کے پاس عاجز کر دیا اور بنٹیا سے بے دردی کے ساتھ ایسے مار مار کر اس کے بدن پھیڑا دیئے وہ اس کے سنگین کی طرح کھودیں مار رہا تھا۔ پہلے جھبری کی دونوں آنکھیں پھوڑی گئی تھیں پھر نام کے تایا نے محض غصے میں آ کر بلا ضرورت ہی بے دردی سے کئی سکوٹوں کے پاس کھڑے ہوئے دو پہر بیٹے کے پودوں کو لاٹھیاں مار مار کر توڑ دیا تھا۔ اسے انہیں اٹھا اٹھا کر زور زور سے ادھر ادھر پھینکا تھا۔ کئی پودے اس کے رستے پر پڑے پھینکے تھے۔ اس نے گھروندی پر رکھے ہوئے تمام گھڑوں کو بھی ٹھینکرا ٹھینکرا کر دیا تھا۔ چلتے ہوئے اس نے تنسی کا گملا بھی لاٹھی سے پھوڑ کر ٹھینکر سے اور مٹی ادھر ادھر بکھیر دی تھی۔ جب تزکی کے باپ کو پتہ چلا کہ ہر نام نے چند لمحہ ہوش آنے پر یہ کہا تھا کہ گھوڑی کو کتیا نے ہڑکائی تھی تو وہ گنگا کی قسم کھا کر جھجھ کو یقین دلانے لگا کہ کتیا تو بندھی ہوئی تھی تزکی نے ڈر کے مارے اصلی واقعے کو پوشیدہ رکھا لیکن اب تزکی کی دانستگی ختم ہو کر جان میں جان آ گئی تھی۔

جھجھ چلا گیا تو تینوں گھر والے پھر اپنے بستروں میں آ لیٹے تزکی کی کہہ رہی تھی کہ بھگوان کرے وہ بھی مر جائے جس نے اس کی کتیا کو مروایا ہے اور دو پہر بیٹے توڑ دیئے ہیں پھر ہر نام کے گھر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں اس وقت ہر نام کی دونوں بہنیں اپنے سسرال سے بھائی

کو دیکھنے آئی تھیں اور وہ سرنام کو بُری حالت میں دیکھ کر رو رہی تھیں۔ تزوکی کو خیال ہو گیا کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے اور سرنام کا خاتمہ ہو گیا۔ اسے کچھ خوشی سی ہونے لگی پھر اسے نیلی دھوتی میں سے نکلی ہوئی خاکستری پنڈلیاں یاد آ گئیں، جو گیتوں والی مچھلی کی پنڈلیوں کی طرح گول گول تھیں۔ اب اسے یہ خیال آیا کہ اس کی گھوڑی کی آنکھ تو میں نے ہی پھوڑی تھی اور میرے ہی پتھر پھینکنے پر گھوڑی بھڑکی تھی اور وہ گرا تھا تو اس لیے مجھے ذلیل و خوار کرنے کو کتیا کہا۔ اسے مجھ سے سخت نفرت ہو گی۔ اس کی پنڈلیاں گیتوں والی مچھلی ایسی تھیں تو کیا؟ اس نے مجھے گالی تک دی تھی مجھ پر چڑیل کے لڑکے کے ساتھ ملی ہوئی ہونے کا الزام بے جا لگایا تھا۔

یہ غم و غصہ اور نفرت کے خیالات پچھلی رات تک اس کے دل میں جاگزیں رہے لیکن پھر اس کے دل میں یہ بات بھی آنے لگی کہ شاید اسے مجھ سے کہیں پیار نہ ہو جو اس نے میرا نام نہیں لیا۔ جو وہ میرا نام لے لیتا تو اس کا باپ مجھے بھی بھیڑی کی طرح مار سکتا تھا۔ خون کا بدلہ خون ہے۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اس پر تغیر اثر تو ہو رہا تھا لیکن دل اس کا جواب ان الفاظ میں دے رہا تھا کہ "للیتاجی! تیری ملا پر ہمیشہ سدا اپنی رہے اتنی تپتی نہ ہو۔ مکھڑا لال انگاری بنا لیا ہے۔ کہیں کپڑوں میں آگ نہ لگ جائے۔"

پھر ایک زبردست کشمکش جاری ہو گئی۔ اسے مجھ سے نفرت تھی؟ اسے مجھ سے پیار تھا؛ اور اس کی پنڈلیاں گیتوں والی مچھلی، ایسی گول گول تھیں۔ جوں جوں رات گذرتی گئی اسی تناسب سے یہ خیال تقویت پکڑتا گیا۔

کہ اسے مجھ سے محبت تھی۔ جیسے کسی پیالے میں متقطر پانی ٹپکے ٹپکے پڑ کے پیالہ لبریز ہو جائے صبح صادق کے وقت ترلوکی کے دل میں یہ خیال پورا استحکام پکڑ گیا تھا کہ ہرنام کو اس سے پیار تھا۔ اور دردمندی پیدا ہو کر دل باختگی بڑھ گئی۔ اب وہ بستر میں نہیں لیٹ سکتی تھی۔

جس طرح کپل وستو کا شہزادہ رات کے وقت اپنے بیوی بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر نکل گیا تھا ترلوکی اپنے ماں باپ کو بستر میں محوِ شکرِ خواب چھوڑ کر گھر والوں کے پاس شوالے میں پہنچی۔ اس وقت شوالے کے گنبد پہ کلس کے نیچے بار بار دُم نیچے اوپر کرنے والی کالی چڑیا بیٹھی ہوئی کھڑا گا رہی تھی اور سدا سہاگن کا جوڑا بغیا میں کھیل کھلاڑیاں کرتا، اڑتا، بولتا، کبھی اس شاخ پر اڑ کر بیٹھ رہا تھا کبھی اس پر۔ اندر گھنٹے بج رہے تھے اور منی گھنشیام داس سنکھ بجا رہا تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے ترلوکی مندر کے عقبی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو کر سدا سہاگن کے جوڑے کی خوش مستیاں دیکھنے لگی۔ اسے خیال آ رہے تھے...... میرا اور اس کا بھی خوب سا جوڑا ہے۔ جس کی پنڈلیاں گیتوں والی مچھلی ایسی ہیں۔ ہم دونوں بھی انہیں پنچھیوں کی مانند ہیں۔ میں کھلاڑا ہوں وہ کھلاڑا۔ پر یہ بغیا ہمارے لئے کم ہے۔ ہم تو نہر پار کھڑے ہوئے باغ میں کھیل کھلاڑیاں کرتے، اڑتے، بولتے، اڑتے پھرتے۔

ترلوکی دو طرفہ کھڑے ہوئے کیلوں کے درمیان روش سے ہوتی ہوئی پچھلی پھلواڑی کی طرف گئی جہاں گل تسبیح اور کنیر کے سرخ، زرد اور آسمانی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے ایک سرخ کنیر کی جڑ کھرپی سے اکھاڑی

اور مچھلی بھون کے پانی میں دھو کر کھائی ۔ کنیر کی جڑ میں زہر ہوتا ہے ۔ جب سرنام ہی دنیا میں نہیں جس کی ہلاکت کی بانی رہ گئی تو پھر ترلوکی کیوں زندہ ہے ۔ کنیر کی جڑ کھا کر وہ دوڑی دوڑی اپنے گھر پہنچی ۔ اس کے ماں باپ ابھی سو رہے تھے ۔ وہ بھی بیچ والے بستر میں سو گئی ۔

پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہولیں اٹھ رہی ہوں اور اس کے دل و جگر کو سلاتے ہوئے اجگر ڈس رہے تھے ۔ وہ تکلیف میں بڑی طرح تڑپ رہی تھی ۔ اس کے ماں باپ کو کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے سرنام ابھی تک زندہ تھا قصبہ مہوریہ کے ڈاکٹر نے جو دن چڑھے پہنچا آج یہ مژدہ سنایا کہ وہ خطرے سے باہر ہے اور ڈاکٹر کے بیٹھے بیٹھے ہی اسے ہوش آگیا تھا سارے گاؤں میں اڑتی اڑتی یہ خبر سرنام کے کانوں تک بھی پہنچ گئی کہ ترلوکی مر رہی ہے مگر خبر نہیں کیوں ؟ اس کی بیماری کا علم نہیں تھا ۔

جب ڈاکٹر سرنام کے زنان خانے کی ڈیوڑھی سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ سرنام کا تایا بھی تھا اس کی چال فوجی تھی وہ تھوڑا سا سینہ نکال کر کچھ کچھ ہاتھ جھٹک رہا تھا ۔ رتھ میں بیٹھنے کے ساتھ ہی ترلوکی کے باپ نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اس کی لڑکی کو دیکھ لے ۔ سرنام کا تایا حسب عادت اپنی ناگوار سچی بڑائی اور نمبر داری جتاتے ہوئے بولا کہ ڈاکٹر سرنام کو دیکھنے آیا ہے فیس انہوں نے دی ہے دوسرے کے گھر میں مفت کیوں جائے ۔

لیکن ڈاکٹر نے یہ بات یوں مسترد کر دی کہ اس کے لئے قانوناً لازم ہے کہ ایسے مریض کو ضروری طبی امداد بہم پہنچائے ۔ سرنام کا تایا بلا سلام مجرا کئے غیر رسمی

طریقے پر رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر نے فوراً تشخیص کر لی کہ ترلوکی پر زہر کا اثر ہے اور اسے دوا دینی شروع کر دی۔ جو یہ تھوڑی دیر تک نہ پہنچتا تو ترلوکی ہو لی ہوتی لیکن وہ ابھی تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کے لئے جلد از جلد تحصیل ہسپتال سے دوا لانے کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔ ترلوکی کا باپ ڈاکٹر کے ساتھ ہی ہو گیا گو رہلو میں کافی جگہ تھی۔ وہاں اکیلا ڈاکٹر ہی تو بیٹھا تھا لیکن سرنام کے تایا نے ترلوکی کے باپ کو بیٹھنے کی اجازت نہ دی حالانکہ وہ اس کے گوڈوں تک پڑا تھا اور ڈاکٹر نے بھی سفارش کی تھی۔ وہ خود رہلو میں بیٹھ کر شماتت کے ساتھ رہلوبان کو تقاضے کرنے لگا کہ رہلو تیز چلائے تاکہ ترلوکی کا باپ پیچھے پیچھے گرد و غبار میں اٹا چلا آئے۔ وہ گاؤں کے نکاس سے ہی رہلو کے پیچھے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ اور سرنام کے تایا کی اپنی کارگزاری پر باچھیں سی کھلی جا رہی تھیں۔ رہلوبان کو بھیج ڈاکٹر کے پاس بھگا کر اس نے پینی خود سنبھال لی تھی اور بیلوں کا مار مار کر ناس کر دیا تھا۔

۳

گو ترلوکی اور سرنام خطرے سے باہر ہو گئے تھے لیکن انہیں تو اب پریم کا جنم روگ لگ گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ اپنے اپنے گھروں میں بیماری کے بستروں میں پڑے ہوئے ایک دوسرے کو یاد کرنے لگے

جس طرح ملاح کو اپنی کشتی کا پتوار، لنگر اور دنیا نہیں بھولتا اسی طرح سے انہیں
ایک دوسرے کے نقشے نہیں بھولتے تھے۔ ترلوکی کو نیلی سی دھوتی سے
وہ مخمل گوں پنڈلیاں ہر وقت یاد رہنے لگی تھیں۔ جو گیتوں والی "مچھی" کی پنڈلیوں
ایسی گول گول تھیں۔ ہرنام کے ذہن میں ہر وقت وہ صفاکیش نظر نواز اور درخشنی
گمراہ رہنے لگا تھا۔ جس کے سفید موتی ایسے آبدار رخساروں کے پاس بڑی پونمنی
جامن ایسی تیرہ تار پلکیوں والی دو کھلواں کھلواں آنکھیں تھیں۔ ترلوکی کے
اعصاب پر ہر وقت ہرنام طاری تھا اور ہرنام کے اعصاب پر ترلوکی۔ ہرنام اس
کے بلاف وہ جذبات پہ تلا ہوا تھا۔ اس کے دل میں ترلوکی سے ملتے ہی اس نا منے عیا
گداز اچھل جانے کی تھی اور جس طرح کپلا گائے کا سیانا ابلا اتھوں جو گئے وقت گوڈے
ٹیکے ٹیک کر دم اٹھا کر زیادہ دودھ پینے کی خاطر بار بار بھی ہیں جھٹکے سے مارا کرتا
ہے، ہرنام بھی اس کے ساتھ اسی طرح سے پیش آیا۔ ایک دوسرے کے شوق
ملاقات نے انہیں جلد صحت یاب کر دیا۔ حالانکہ سیر بھی دار کھیتوں پر ٹھنڈی آئی
لگی ساون کی ہوا اور میوا رہیں کبھی اتنی مگن ہو کر نہ لہرائی ہو گی جتنی اس لڑکی کو ہرنام
سے ملنے کی خوشی ہوا کی تھی۔

ہرنام کو ان دنوں ایک یاد آ رہی تھی یہ یاد اسے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔
پڑیوں والے گھاٹ سے اصل نہر کی چھوٹی سی راج باہے نما دھار الگ ہو
کر مشرق کی طرف بہتی ہوئی ٹاپو سا بنا کر فرش والے گھاٹ پر اصل نہر سے جا
ملی ہے۔ پچھلی گرمیوں میں آج کل اس ٹاپو کے ٹکڑوں میں لڑکیاں آ بیٹھی جالیں
لگا کر مچھلیاں پکڑ رہی تھیں۔ یہ محض شوق کی خاطر تھا۔ مچھلیاں کھانے کے لئے نہ تھیں

انہیں لڑکیوں میں ترلوکی بھی تھی۔ اس کھیل سے فارغ ہو کر باقی لڑکیاں جو پیڑیوں والے گھاٹ کی طرف رہتی تھیں وہ تو پیڑیوں والے گھاٹ کی طرف چل دیں مگر ترلوکی جس کا گھر ریڑے کی طرف تھا وہ ریڑے کے سامنے ہی شاخ نہر کو عبور کرنے لگی۔ پچھلے سال یہاں صرف گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا لیکن اب یہاں کنڈی پڑ گئی تھی اور نہر بھی لبالب چل رہی تھی کیونکہ سخت دھوپ کے سبب پہاڑوں کا برف خوب پگھل رہا تھا۔ اس لئے ترلوکی ڈوب گئی اور اسے سرنام نے باہر نکالا جو نہانے کے لئے کپڑے اتار رہا تھا۔

ترلوکی کا پنڈا جو سرنام کے بدن سے اس وقت لگا تھا جبکہ وہ اسے اٹھا کر ڈوب والے سرے کنارے پر ڈالنے کے لئے لایا تھا۔ اسے وہ جس یاد آ رہی تھی اور ترلوکی کا ٹھنڈے ہونٹ کھولے ہوئے بے سدھ چت لیٹنا۔ پھر اس نے ترلوکی کو اوندھی لٹا دی تھی تاکہ پیٹ سے پانی نکل سکے۔ بھیگ کر چپکی ہوئی کرتی میں سے اس کے جسم کی شوبھا کچن چپڑ کو مات کر رہی تھی۔

اب ترلوکی چوہدری کیدار کی معافی ملک میں سے ہوتی ہوئی گھر جانے لگی۔ یہ ملک کنڈی کے پاس تھی اور اس میں چاروں طرف اننڈ کی باڑ تھی جس میں ہرن تمیتر رہا کرتے تھے۔ جب ترلوکی رکھوالے کی جھونپڑی کے پاس سے گزرنے لگی تو اسے چکر آ گئے۔ اس لئے وہ اندر جا کر زمین پر لیٹ گئی۔ چوہدری کیدار کا گورا گورا پاٹھا سا پوت پاس چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کے بھیگے ہوئے کپڑے مٹی میں خراب ہو جائیں گے اسے چارپائی

پر ڈال ڈالا۔ پھر اس کے دل میں بدی آ گئی اور وہ اسے چنگا بنانے ہی والا تھا کہ ہرنام کے پیچھے تایا نے اگر لاٹھی سے اس کی ٹوکری میں کھود ماری۔ چوکیدار کا گورا لڑکا بھاگ پڑا۔ جتنا بھی اس کے پیچھے شور مچا ہرا بھاگ رہا تھا۔ شام سے پہلے پہلے یہ پوری داستاں سارے گاؤں میں پھیل گئی اور سب لوگ چوکیدار کے گورے لڑکے کو گالیاں دے رہے تھے۔ کوئی کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ دھوبے راؤ نے داؤ تو پہلے ہی ہار لیا ہو گا۔ ایک دو کھو بھی کھا لی تو پھر بھی گھاٹے میں نہیں رہا۔ کیونکہ چوکیدار کا لڑکا گورا تھا اس سے نفرت کھا کر اسے دھوبے راؤ کہہ رہے تھے۔ ریڑے کے پاس گونڈے میں جو ہرنام نے ترلوکی کو چوکیدار کے لڑکے سے ملی ہوئی ہونے کا چرکا دیا تھا تو اس کی اساس بھی اس واقعے پر موقوف تھی۔۔۔

ایک شب جب کیکروں والے ریڑے سے بیر اٹھ چکے تھے اور دانکا بچا کھچا دانہ ڈنکا جنگلی کبوتر اور دوسرے پرندوں نے چُگ لیا تھا۔ لوکاٹوں اور شہتوت کی بہار ختم ہو چکی تھی۔ خربوزے، تربوز اور رائیتا آم چل رہا تھا۔ چاندنی سی رات تھی لیکن کناری چاند گرد و غبار میں ایسا آیا ہوا تھا جیسے ڈھیری کی جھتی میں چراغ جل رہا ہو۔ تارہ ایک بھی نہیں تھا۔ بہت ہلکی گرم ہوا چل رہی تھی۔ اتر کی سمت دور دور پھیلے ہوئے بیلو، کریر اور تیندو کے جنگل میں گیدڑ اور لگڑ بگھے بول رہے تھے کنڈی کے پاس دائی بلک میں چوکیدار کا لڑکا وارث پہ گا رہا تھا۔۔۔

میرے من کا بیتریا سہر گیا ری سہر گیا ری

میرے من کا لیتو یا سہر گیا ری سہر گیا ری
دکھ کا دو دیا سہر گیا ری سہر گیا ری
دکھ کا دو دیا سہر گیا ری سہر گیا ری
گاں (گاؤں) کا رسو یا سہر گیا ری سہر گیا ری

قصبہ مہوریہ کی طرف سے جدھر گاؤں کا دوسرا ادھ اجڑا علاقہ پڑا ہوا ہے۔ ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے غول بیابانی واویلا کر رہے ہوں۔ تو ڈھک دلی کے دو داسی اس طرح گفتگو کر رہے تھے:

"اے ہرنامے! تیں مر ہی جاتا تو اچھا تھا۔"

"ترلوکی جیتی رہتی تو اچھا تھا۔"

"کیوں رے کیوں ہرنامے؟"

"کوئی مہارا بھی تو یاد کرن والا ہوتا۔"

"تیرے ماتا پتا ہور کٹم والے مر گئے تھے جو ترلوکی تجھے یاد کرتی رہے ہرنامے؟"

"جس طرح تمہیں یاد کرتی، وہ یاد نہ کرتے۔ تیں تو مجھے کدھی بھی نہ بھولتی۔"

"میرا بیاہ ہو جاتا تو بھول جاتی۔"

"تیں بیاہ ہی نہ کرواتی۔"

"جو میرے ماں باپ کر دیتے۔"

"وہ بیاہ ہونا ہی نہ تھا۔"

"ہور کیا ہوتا رے سرناے۔"

"ہوتا جو ہوتا۔ تجھے ڈانوری ماں باندھ جوڑ کے لے جاتے تو یا تو تیں جد مالک کے گھر جاتی یا گھاس کی جالی میں باندھ کے لے جاتے تب جانی و یسے نہ جاتی۔"

"رہنے ہو سٹے کیوں رے سرناے گھاس کی جالی ماں کیوں ؟"

"ناج کے بورے ماں لے جاتے تو دم گھٹ جاتا جالی دار بورے ماں سانس تو لیتی رہتی۔"

"جا رے جا سرناے۔"

"ہمیں بی چل ندی پا چلیں گے۔"

"وہاں جا کے سرنا ماڈوبے گا؟"

"ڈوبا تو نئیں کے سے ہے۔ میں تو تجھے تو نبی کا طرحاں کدی بی اس بغل ماں دبا ؤنگا کدھی اس ماں، کدھی چھاتی تلے ہور کنڈلیاں مارتے ہوئے پانی ماں تجھے لیئوں کھوب تیرتا پھیرونگا۔"

"میں سرناے کی بغل سے اس طروں نکل جاؤں گی جس طروں امیا کی بجلی چٹکی سے پھسل کے دوجا دوجا"

"تیں کس طروں بولے ہے۔"

اس طروں بولے ہے اک رگرا) تجھے یوں بولتی ہوئی دیکھ کر میرا جی چاہن لگا تجھے اسی وکھت جھوجھو جھبوٹے دیں لگوں"

"چپ چپ رے تجھے اب میں تجھے چپر تپا تیا کہا . . . . . ہورا تنی اڈنگ

بڑ ننگ نہ بانگ نہیں تو پھر چھڑا کا ہو جاگا۔ للیتا جی پھر اسی دن کی طرح وں گُسے ماں بھر جاگی ہے

"ہر کسی کا کیہا نکسان (نقصان) ہو گا للیتا جی نے تتی ہو کے مونہہ لال انگاری بنایا تو اس کے کپڑوں ماں آگ لگ جاگی۔ اچھا تیں جہر (زہر) کیوں کھایا تھا بتا؟"

"تیں بے مار (بیمار) کیوں ہو اتھا رے سرنامے بتا؟"

"تیں تتیر پھینک کے ماسے تھے۔ گھوڑی بد گادی بھتی میں گر گیا تھا۔"

"تیں کچا سوا ہے سرنامے بتا!"

"للیتا جی! بھلا جد پائیتے والے دن جکہ یداں ماچو کھے مجرے کے تے کھیڑا ایچگاں کے پٹھان، رانگھڑ ٹلوالے کے رجپوت، منی پور کے سید کھونٹے پچھاڑنے نوں اپنے اپنے چنگواں گھوڑاں پر آئے تھے تو سب سے جادہ کھونٹے کس نے پچھاڑے تھے، ہو نہ ہو پہلوان کے مونڈھا باپ بیٹھ کے کس نکھٹری کا بھلوس نکلا تھا؟"

"تیرا ہتیرا، تیرا ہتیرا اُرے ڈینگیے تیرا! نیں تو لیو دھن ہو تہ تیج دَنت ہو سے۔ پر اس دن میرا جی بہت دہلا تھا۔"

"کیوں؟"

"تیں مجھے ہاتھ لپک سا دیکھے تھا۔ کچھ گنگنا کنکتا سا ڈھیلا ڈھیلا بھر بھر ابھر دبرا ہیں مجبوں تھتی بیو کتا سوا ہو گا۔ اس کی عمراں سب سے تھوڑی تھی۔ یہ جبرہ ہر جاگا۔ اس کی پنڈلیاں گیتوں والی لچھی ایسی ہیں۔ ہو اگر

ننگڑیوں سے گھوڑی نو کس طرداں کا بو مار رکھے گا ؟"

"میں تو جب تجھے تلک نو کا بو (قابو) ماں رکھ سکوں ہوں۔ ہور (اور) تیں اوندن چکر ملاں بس میری پنڈلیاں ہی دیکھتی رہی ہو گی، ہور کچھ نہ دیکھا ہو گا ؟"

دہرٹ سے گمانی سرنامے بتیں کونسا ایسا کلے ٹھلے کا گبھرو ہے۔ نیں اونچا ہے نا نیچا، موٹا ہے نہ پتلا، کالا ہے نہ گورا، کچھ بھی تو نی ہے۔ تجھے اپنی پنڈلیاں سوہنی لگتی ہوں گی تو تیں ہی انہیں چومتا چاٹتا رہا کر۔ ارے سرنامے تیں بتا سکے ہے میں نے تجھے پہلوں پہل کد دیکھا تھا۔؟"

"مجھے کیا کھبر"

"جد تیں رو سا رو سا گوجھر والی تلیا کے دھورے بیٹھا تھا اپنے تایا سے تھاپڑ کھا کے۔"

ہاں ہاں۔ جد تمہاری کپلا گائے نے مھارے ایکھ کے پودے کھائے تھے جس کی زرا سی کل ہوئی تھی ہیں تو۔ سوچا تھا چلو نو کی گائے نو بی اپنا دل خوش کر لے۔ پودے بھیر مول آدمی نے، اوپر سے تایا آ گیا تھا۔"

"اس نے کپلا نو بی کتنا مارا تھا۔ دو لاٹھیاں منہ پہ لگی تھیں سو وہ تو آنکھ پھوٹتے بچا سا پھاس سا رہ گیا تھا۔"

"تو تیں گوجھر والی تلیا پہ رو سا رو سا بیٹھا تھا۔ دھورے سے ٹھیکرے ڈیلا سا کی ایک چپیا پانی پہ گری تو نہ تو کھڑ کا ہوا نہ پانی پہ چھیل پڑے۔ تیرا منہ تلیا ماں ایسا لگے تھا جیسے میں تجھے ویسے ماں دیکھ رہی ہوں۔ میں تو تجھے دیکھ کیل دی۔ تیں سن طروں بیٹھ جاتا جس طروں گھرائوں دئے بداسے کی مورتی۔ اچھا رے یہ بتاں

چھوڑ! تیں پتہ تا گھوڑی تو میں نے بدکائی ہتی تیں جھبڑی کا ناؤں یوں ہی لے
...دیا تھا۔ اسے کیوں ناحق مار مروائی۔؟"

"میں جیارہوں تھا۔ اپنا ناؤں تیں تاتی پھرتی۔"

ہور جھبڑی کی طرواں لٹھوں سے ماری جاتی۔ پرے رے سرناماں تیں
انگین کر پانہ کر۔ میرا انداڑ ہوتا تھا اک گھوڑی کی آنکھ پھوڑدوں ہور تیں تلے نا
گرے۔ مجھے معاف کر دے رے سرنامے۔ میں تیرے پاؤں پڑدوں" اور اس
کا جی بھر آیا اور وہ رو رہی تھی۔

"یہ کیوں؟"

"جو تیں مرجاتا"

"میں مرجاتا تو کیا تھا۔ کرنی کی طرواں کھال مال مجوسہ بھر کے اپنے
صواب جے رکھ لیا ہوتا۔ ہور بھی آتے جاتے دیکھتے اتیں بھی.......
.... دیکھتی"

جب بہت سے خوبصورت خوبصورت بلوریں موتی یکے بعد دیگرے
رخساروں پر سے پھسل پھسل کر جلد جلد زمین پر گرنے لگے تو سرنام اپنی
دھوتی سے اس کی آنکھیں اور گال پونچھنے لگا۔ پلو اٹھنے سے اس کی داہنی
پنڈلی اور ران تر بوکی کو نظر آ رہے تھے۔ اشک ریزی کچھ دیر جاری رہتی لیکن
پنڈلی اور ران کی نمکینی نے ایسا لہرا لگایا کہ وہ مجبور ہو گئی کہ اسے صاف نگاہوں
سے نظر نہ آنے دیکھے۔ پھر سرنام نے پیار اور رحم کے جذبے میں آ کر اس
لہک لہک کر باتیں کرنے والی کی بچی مصرفی چاہی، دہاس کے قوالے سے

لال لال ہونٹوں اور جھکا جھک رخساروں پر بٹ کرنا چاہتا تھا۔ اسے پاپ احساس کی سوجھ رہی تھی۔ ترلوکی پھدکتی چڑیا کی طرح بچک کر ذرا دور کھڑی ہوگئی۔ ہرنام بولا "ستیاناس گئی باتیں تو میرے سے اس طرح پلا جھاڑ کے الگ کھڑی ہوگئی جیسے تیرے اوپر کملا چڑھ رہا ہو۔ ننگی بنا چھوڑ۔ ڈھب ہو جا۔" ترلوکی کے منہ میں اس وقت یہ الفاظ تھے "او نانا نانا رے نانا رے نا جوانی کھائے! ابھی میری مکھی نہ بھر آ پہلوں ہتھ لیوا کر لیں۔ میں تو تیری سہرے ڈدے کی بیاہتا بننا چاہتی ہوں، مجھے لگتی نجاران کی طرح نار ارکھنے میں تو تیرا دیا ہوا سیس پھول پہروں گی۔ جب تیں اک نوالہ کھانے گا بندی بھی اک ہی کھا دے گی جا دہ نہیں۔"

ان دونوں نے ہاتھ ملائے تو ترلوکی بولی "جو کوئی ترلوکی کو سیناگ کی من تار کے دیتا تو وہ اس کی نہ ہوتی پر تیری ہو چکی۔ تیں ترلوکی کا ناتھ ہے۔ سورج مکھی کا پھول جس طرف سورج ہوگا اسی طرف جھکے گا۔ تیں سورج ہے، میں سورج مکھی، میں تیری آدھین ہوگئی۔"

اس وقت اس کے چہرے پہ اتنا چلبلا پن، شعبدہ بازی، نقل، تحیّر اور نشہ خیزی تھی کہ اسے شیطانی جادو کہہ سکتے تھے۔ یہ وجد و حال نہیں تھا۔ دونوں کے کنول خوب ہی کھل رہے تھے۔ اس وقت ہرنام جو کچھ بھی کر گزرتا مداخلت بلا مرضی نہ ہوتی۔ جب کوئی خود ہی دانی بن جائے تو لوٹ کھسوٹ کی کیا حاجت لیکن وہ اوپر کے جی سے تھوڑی تھوڑی بوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ارے کھڑے گھاٹ کا دھلا اچھا نہیں ہوتا۔ صبر کر صبر۔ کیسی باندھے بہ

تیسے جادو بڑھا چڑھا تو وہ جو تھوڑا بہت دوستانہ ہوا ہے اُسے بھی کھٹاک سے توڑ کے رکھ دوں گی۔"

یوں غیر آبادگی سی دکھانے سے کیا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے ہونٹوں میں مچمچاہٹیں بھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں تماش بینیاں اور بُشرے پر مطلق العنانیاں پھر کیفیت انبساطی نے اُسے گنگ سُم کر دیا۔ جبھی ایک طرف سے دھڑ دھڑ دوڑتا ہوا ہرنام کا تایا آ گیا۔ دوسری طرف سے ترلوکی کا باپ اور جس طرح سے کسی کو شہد کی مکھی چمٹ جائے اور اسے کوئی جدا کرے۔ باپ نے بیٹی کو، تایا نے بھتیجے کو جدا کر لیا۔ تایا ہرنام کو اس طرح سے کھینچے جا رہا تھا جیسے وہ قیدی ہو۔

۴

اب ترلوکی پہ پہرے بیٹھ گئے۔ وہ باہر نہ نکلتی تھی۔ ہرنام کا تایا کھلے خزانے کہتا پھرتا تھا کہ وہ اسے کہیں دکھائی دی تو جھٹکا کر کے اس کا سر لٹھوں سے جدا کر دے گا۔ جب اسے کوئی کہتا "ان دونوں کا بیاہ کر دو۔" تو وہ شیخیت بگھارتے ہوئے ہرنہ دہائی کرتا۔ بیاہ اسنائی یا چھے بیاہ! وہ تو اس کا پہلو ہی کمبختا کر چکا ہے۔ بیاہ کر کے کیا ہے گا۔ لاوے کے بھبوکے کا باڑی، ایکھ کمی کی نراقی کرنے والے مجدور کی بیٹی کے ساتھ ہمارے بھتیجے کا بیاہ۔ جیرلیو ایسا ہوتا اگر آگے ہات نہ پا چھے پگا تو اس کی شادی مجدوروں ماں

ہو جاتی۔ جو ترلوکی کا باپ تمہارے گاؤں سے کسی شہر جا کے بیلوں کو جوتنے کھانا پھرے پھر بڑی مشکلوں سے اسے پکّے داری مل جا ہو رہا تھا پڑھت پر کسی بنئیے بکال کا گھر پھاڑ کے مایا لا دے۔ اپنا محل گروا کے تی عملہ (تین منزلہ) بنوا دیئے تو پھر بھی اس کی قسمت جیسے ڈیٹی تو تمہارے یہ تیجے جیسا بر نا ہیں ملیگا۔ کھریلی کُتیا تو تو تمہاری بھول نصیب نہ ہوئی پچھو ندر کے سر تو چنبیلی کا تیل نہیں جڑے گا۔ کیا یہ تھوڑی بات ہے جو تمہارے بھتیجے نے ایک مزدور کی بیٹی کے راحت کا ٹیکہ لگوا دیا۔ چونی کی ردی کی ایک ٹکی مرگ کے سروے ماڑ لو کے کھالی۔ گیہوں کے کھیت ماہیوں بھی تو اسے پھاڑ پھینکنا چاہیے۔ کچھ بے حد مکروہ الفاظ جو گھاسی رام استعمال کرتا پھرتا تھا یہ تھے۔ میں تو لو دیکھا تھا جس طرح کوئی کاغذ یہ گوڑھ کرے انگوٹھے پر رسائی کم لگی ہوئی ہو، داشان پڑنے کی خاطر گوٹھے لوں اس طرح دبا دے جیسے دو سانپ کا ہمیں دبا رہا ہو بس یوں ہی ہو رہی تھی؟ مگر یہ سفید جھوٹ تھا کیونکہ وہاں ایسی ویسی کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ وہ تو دونوں فرشتوں کی طرح پاک صاف اور بے گناہ تھے۔

خاکہ اڑانے کے لئے یہ تکلیف وہ چرچے ڈزبیں اور بک جھک "لاوے گا" چھوڑ گئے، باڑی ایکھ، گنی کی نرائی کرنے والے مزدور کی بیٹی کے ساتھ تمہارے بھتیجے کا بیاہ" ترلوکی کے کانوں میں پڑے تو اُسے اپنی تہی دامنی پہ سخت قلق ہوا۔ جو اس کا دادا شراب اور عورت کی علت میں زمین نہ بیچتا اور اس کے بھی آٹھ ہلوں کی کھیتی ہوتی تو ہر نام کا تایا اپنی میمھوں نسبی

پر نہ اتراتا نہ اسے وجہ نازش ہوتی اور نہ وہ دوسروں کی غریبی پر آتشنے چھینٹے مارتا۔

کئی مہینے گھر بند رہنے کے بعد نرلوکی کا بیاہ پہاڑ میں گئے ہوئے کسی دوکاندار سے ہو گیا۔ جو ڈھک وئی سے گڑ خرید کرنے جایا کرتا تھا۔ جب وہ دلہن بنی تو اس نے نائن کی چھوکری کو اجرت کا روپیہ دیکر ہرنام کے پاس بھیجا۔ "ارے گجب مارے تیرے سیں ٹمکٹے بدلے! نرلوکی نے جی ٹھا لے ہم تو پہڑ جارہے ہیں جہاں سے اس مہارہی نہر کا پانی آوے ہے۔ چوماسے کے دنوں مار پڑے پاجا بیٹھے۔ جب یہ ساتی ندی چڑھیگی تو تیں دیکھے گا میری لھاس پہاڑ سے بہتی ہوئی آرہی ہے۔ تیں بلیڈ ماں آکے اسے پکڑنے کی کوشش نہ کریو۔ پکڑ کے کیا لے گا۔ بہہ جانے دیئے جہاں پہ جا کے رکے۔ مجھے دیکھ کے چھاتی بھر آوے تو سچ سچ رو لیئے۔ جو رجو رہ سے رویا تو تیرا تایا پلٹیا ہے وہ کہے گا بے کیوں بیر بانیوں کی طرح رو رہے ہے تیرا کوئی مر تو نہیں گیا، میں تیری کیا لگتی، اس نے مہاری جھجری تو ڈھو کر ماروی تھی۔ تیرے ہتھاپڑ جما دے گا۔" پیغام سنتے ہی ہرنام کی چیخ نکل گئی اور اس نے مقام سے اپنا سر دے مارا۔ نائی کی چھوکری ڈر کے ماری بھاگی کہ یہ کیا ہو گیا۔ تایا جو اسارے میں بیٹھا ڈیلے کے اچار اور دہی سے دوپہر کی روٹی کھا رہا تھا لڑکے کو دیکھ کر بھبکا۔ "پگل لیو، پگل لیو، پکڑ لیو یو دا کی کھبر لائی ہو گی۔" لڑکی یہ کہڑا کے دار آواز سنتے ہی صحن میں گر پڑی اور تایا نے پڑی ہی کی کمر میں مکے مارتے ہوئے باہیں پکڑ کر اٹھا لیا اور

پھر گھسیٹتے ہوئے ڈیوڑھی تک لے جا کر گردنی دیتے ہوئے کلیارے میں نکال دیا۔

لوٹ کر اس نے اپنے بھتیجے کو ڈانٹا "ڈولا تو اٹھ جان دے، ابھی سے مٹکنے لگا۔" اس پر وہ اور بھی چلانے لگا کہ "ہائے میں کیا کروں، ہائے میں کیا کروں۔" اسے اصل میں اس وقت ترلوکی کے یہ فقرے یاد آ رہے تھے: "نا رے نا ابھی میری گھوبی نہ بھرآ، پہلوں ہتھ لیا کر لیں جو کوئی ترلوکی کو سپیں ناگ کی من پی تار کے (اتار کے) دیتا وہ اس کی نہ ہوتی پر تیری ہو چکی.......... نا رے نا .... نا رے نا۔" یہ الفاظ اس کے کانوں میں خاص طور پر گھنٹی کی طرح بج رہے تھے اور اس کا طرفہ تماشہ چہرہ یاد آ رہا تھا۔

دلہا کے ساتھ باجے گاجے تھے۔ بارہ ماسی بیلداروں کی چوکی سے ذرا دور رہٹوں کے پاس نہر کی کلر پٹڑی پر باجے بجنے شروع ہو گئے۔ ہرنام کے تایا نے انہیں سنتے ہی کہا "لو بھئی جا کے رہیو سہرے والا آ گیا پر اسے کہہ دیو دھک وئی کی سپھید مولی پڑی کا چیر پڑی ہے کھوب نمک لگا کر کھائے۔"

ترلوکی یہ باجے سنتے ہی کپڑے پھاڑنا چاہ رہی تھی۔ اور ہرنام ان کی پوں پوں دھوں دھوں پر شمال کی طرف دوڑا اور گوجرا اور ڈیک والی تلیا کے پاس سے گزرتا ہوا، کریر اور ببولوں کے جنگل میں نکل گیا۔ اس کے سامنے گیدڑ، گرگٹ اور کلانچیں بھرتے ہوئے چیتل سانبھر آئے

لیکن وہ انہیں میں سے جاگتا ہوا جلا جا رہا تھا۔ جب وہ پرلے سرے پر پہنچا تو وہاں ٹرک چپ چاپ سب تھے۔ یہاں اسے باجوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کے سامنے نگر اور بلاغمل غش پانی کی چھوٹی سی دھارا بہہ رہی تھی۔ وہ فوراً پانی پینے لگا۔ اس نے رات یہیں کاٹی۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ درندے پانی پینے آئیں گے۔ تمام رات اُلو اپنی ہزار داستانیں سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو ڈرا ڈرا کر پکڑتے کھاتے رہے۔ ببلو، کریر، اور تیندو کے جنگل میں گیدڑوں اور گیدڑوں نے قیامت برپا کیے رکھی۔ آسمان پر اور چھوٹی دھارا کے پانی میں ستارے جھلمل جھلمل کرتے رہے۔ رات چڑیوں کی گل بانگ اس کے کانوں میں آتی رہی۔

ترلوکنی اپنی سسرال میں روتی ہوئی گئی، مگر اس کے ہرنامی کو پتا تھا کہ وہ اس کے لئے نہیں لٹکتی رہی تھی کہ باپ کا گھر چھوٹ رہا ہے بلکہ اس لئے کہ ہرنامی کا گاؤں اور ہرنامی چھوٹ رہا ہے۔ اس کا دکھ ہرنامی چھوٹ رہا تھا۔ پاکرنے والیاں تو اسے گود کر مانگ سے ٹھنڈی رہنے کی دعائیں دے رہی تھیں، لیکن وہ منہ منہ میں بین کر رہی تھی: "بھگوان اس کرموں کھوئی کو پھر بھیج کے کیوں مارے ہے۔ مجھے جیانا چاہے تو بھر عمر کو ہرنامی کی سیوا کرنے کے واسطے یہیں چھوڑ دے۔ میں اس پہ مر مٹی۔ میرا جیا اس بنا لوٹے۔ گھن کی چوٹ کھا لوں گی پر اس بنا نا ہیں رہا جاوے گا جو چکر ملان ما پایۓ کے دن میرے من ماچور کھڑکی سے آ کے رہن سہن لگا تھا۔ یو بیاہ ہیں ٹیک کرایا ہے، یو تو میرے ماں باپ نے کیا۔ یو بیاہ

نا ہے۔ جو ہے نہ ہے یہاں کوئی جتنا ساتھی نہیں۔۔۔ مرگھٹ ہے۔ میں
اپنے سرنام کی یاد میں پھڑک پھڑک کے مر جاؤں گی۔ پابیتے کے دن گرد
اڑتا ہوا چلا گئے۔ بیاہ شادی ہا سدا سہاگن۔ پر رے پرسنتا کے پنچھی تیں
مجھے کیا بول بول کے کھا دیے ہے۔ جاتا رہ کہ ہے ہی جیتے جی رہا نہیں تو یہاں
تیرا نیچ مارا جاگا۔ سدا سدا سہاگن!"

ترلوکی کے جانے کے بعد سرنام زیادہ دن گاؤں میں نہ ٹھہر سکا۔ اس
کا چہرا بجران زندگی سے ایسا اترا اترا سا رہنے لگا جیسے اسے زہر باد ہو گیا ہو۔
وہ گویا اس مرغ کی طرح ڈینے گرائے، گردن جھکائے پھر رہا تھا جو رانی کھیت
کی وبا میں مبتلا ہو گیا ہو۔ گو ترلوکی اس سے ملتی نہ تھی لیکن یہ خیال کہ وہ ڈھک
دئی میں موجود تو ہے اس کے دل کو کچھ نہ کچھ ٹکائے رکھتا تھا اور اب جو وہ
پہاڑ ملوں میں چلی ہی گئی تھی تو وہ ٹوٹا ٹوٹا رہتا، گرتا پڑتا سا پھر رہا تھا۔ ڈھک دئی
اور اس کے سوانہ سرنام کو دونوں زہر دکھائی دے رہے تھے۔ جوں جوں دن
ترلوکی کی رخصت کے بعد گزرتا سرنام اسے رمضان کے روزے کی
طرح گنتا اور اس کے دل میں اتنے ہی چور بے چھنے جاتے تھے جیسے کسی
نے تیں سے تولا نکال لیں اور وہ نہیں پکتی۔ سرنام ایسا ہی ہو رہا تھا۔ چپ
چپ، اکھڑا اکھڑا، دکھیا دکھیا سا۔ وہ گھر گاؤں چھوڑ کر گوبند باغ میں پڑا
رہا۔ صبح صبح پیڑیوں والے کھیت کے سامنے نہر میں نہانا اور پھر
دو منزلہ کوٹھے پر پڑی ہوئی سرکی میں اکیلا بیٹھا ہوا حقہ پیتا رہتا۔ دو تین
دن تو گھاسی رام نے اسے کچھ نہ کہا لیکن بعد کو گھر سے روٹی بھیجنی بند کر دی۔

اس کے سامنے نمایاں مثال موجود تھی، جو بیوی کے صدمے میں گاؤں چھوڑ کر لام پر چلا گیا اور وہاں سے غم غلط کر کے وہ اچھی حالت میں لوٹا تھا بلکہ خوب کرنل بن کر۔ اس لئے ایک شب جب برساتی ندی کا ریت چاندنی میں ایسا چمک رہا تھا جیسے ترلوکی ململ کا اونچا سفید قمیص اور بہت سے چُنٹ والا ستھے کا سفید گھگرا تیز دھوپ میں پہنے کھڑی ہو۔ قصبہ بھور بہ کی جانب اجڑ علاقے سے غول بیابانی کی واویلا ایسی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ کہ جس کی بھوسلی بھوسلی پنڈلیاں گیتوں والی لچی ایسی گول تھیں فوج میں بھرتی ہونے کے لئے جا رہا تھا۔ اس کے ارادے کبھی بھی ڈھک وئی لوٹنے کے نہ تھے۔ جاتے جاتے وہ ریڑے پر گیا جہاں ترلوکی نے اس سے اپنی پہلی کھبروائی تھی اور اس نے ترلوکی کے گودھا ایسے رنگت دار ہونٹوں کی طرف منہ بڑھایا تھا۔ یہ اس کے عہد شوق کی یادگار تھی۔ پھر اسے ترلوکی کی بڑی پیوندی جامن ایسی پتلیاں یاد آنے لگیں اور وہ پہاڑوں کی ایک ٹک بیٹھا ہوا دیکھنے لگا جہاں وہ اپنے شوہر کا گھر آباد کرنے کے لئے گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ترلوکی اس کی یاد میں چوڑیاں ٹھنڈی کرتے ہوئے دھاڑ مار کر روتی ہوئی اپنا سر ٹکتوں سے پھوڑتی ہوئی پھر رہی ہے۔ پھر یک لخت وہ گویا ترلوکی کی آواز سننے لگا:

ریڑے پر تو نگل بھاوے میں تو چھاؤنی جاؤں گی

چھاؤنی جاؤں گی چھاؤنی جاؤں گی

وہ تو چھاؤنی بلا رے ہیں تو چھاؤنی جاؤنگی
چھاؤنی جاؤں گی چھاؤنی جاؤں گی

وہ ناک کی سیدھ میں پیلو، کریر اور تیندو کے جنگل میں سے نکلا ہوا انہی پہاڑوں کی طرف چلنے لگا اور کوئی آدھ میل تک چلتا رہا۔ پھر پچھم دشا سے کنیا وانی کا بادل آ گیا۔ آسمان پر زبردست ہڑبڑی مچ گئی۔ وہ اب بھی چلا جا رہا تھا۔ اس کے کپڑے مینہ سے بھیگ چکے تھے چلتے چلتے اس نے قصبہ مہوریہ سے کوہ سرگ پربت جاتی پکی سڑک پکڑ لی۔ یہاں پہاڑ سے ادرک بھر کے لاتا ہوا کوئی ٹرک آ رہا تھا اس نے اشارے سے ٹرک ٹھہرایا اور یوں چھاؤنی کی راہ لی۔ پانی اب بھی پڑ رہا تھا، بادل گھور رہے تھے، اسے ایک پاک خیال آ رہا تھا جو آنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ اس کے تعلقات زلوکی سے بے ڈھنگی قسم کے تھے "برکھا شروع ہو گئی ہے ساون میں سلونو آئے گی۔ میری بہنیں سلونو کے تہوار پر میرے پہونچے سے راکھی باندھا کرتی ہیں اب کے تو میں زلوکی سے راکھی بندھوانا پر اب تو وہ میری بہن نہیں کچھ اور ہے"

دھومن

جب مانڈو کے باپ نے سنا کہ کوئی پاس سے دس میل جو موضع گُجّر والی میں ان کی برادری کی ایک لڑکی مرچی ہے، وہ محبتی جاٹ کے ساتھ سورج ڈھلے تالاب پر پکڑی گئی، تو یہ اگلے ہی دن گُجّر والی پہنچا کر مرچی کو اپنے لڑکے مانڈو کے لئے مانگ لے۔ اسے خیال تھا کہ جو لڑکی اتنی بدنام ہو گئی ہو اس کا کوئی گاہک نہ لگے گا اور مرچی کے بڑے بھائی گھٹنے ٹیک دیں گے۔ کوئی لڑکی پسند نہ کرتی تھی۔ اس کے چہرہ پر بال نہ اُگے تھے اور ٹھوڑی پر جو تھوڑے سے بالوں کا گچھا تھا اس نے چھوٹے کی صورت اور بھی بگاڑ رکھی تھی۔ یہ پھر بھی ان تھوڑے سے بالوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان پر تیل لگاتا اور انہیں انگلیوں میں سہلاتا رہتا لوگ پھر بھی ٹھٹھوں میں اسے ہیجڑا کہتے۔

مانڈو اور اس کی بہن دھومن دونوں ہی روپ رنگ والے تھے لیکن ان میں دو بڑی خرابیاں تھیں ایک تو یہ غریب تھے دوسرے ان کی بابت مشہور تھا کہ یہ موسو بھنگی کی اولاد ہیں ان کی ماں موسو بھنگی کے ساتھ بھاگ بھی گئی تھی۔ مانڈو اور دھومن کا باپ نمازی اور

پرہیز گار آدمی تھا اگر اس کی بیوی بدچلن نکل آئی تھی تو اس میں اسے الزام نہیں دے سکتے تھے۔ اس نے اپنی لڑکی کو قرآن پڑھایا تھا۔ اور وہ باعصمت بھی تھی لیکن ماڑو اپنی ماں پر گیا تھا اس کی بدشہرتی یہاں تک تھی کہ لوگوں نے اسے گائیوں تک سے ناہنجاریت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ماڑو کو کوئی بھی اپنی لڑکی دینے کو تیار نہ تھا البتہ دھرمن کے کچھ گاہک موجود تھے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی کانسی کے کٹورے کو پیتل کی چمچی سے بجا رہا ہو۔ وہ منہ بولتی مورت ایسی تھی۔ ہلکے رنگ کی کلیوں ایسی۔ یہ ماڑو کے باپ کی مرضی تھی کہ دھرمن کو اس طرح سے بیاہا جائے کہ اس کے عوض ماڑو کو بھی بیوی نصیب ہو سکے۔ کوئی اور جتن اس نوجوان کی شادی کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دھرمن بھی اپنے بھائی کے لئے بھینٹ چڑھنے کو تیار تھی۔

ماڑو کے باپ کا مشن کامیاب رہا۔ مرچی کی شادی ماڑو سے اور دھرمن کی گھگے سے طے پاگئی۔ یہ آٹے ساٹے کا رشتہ تھا۔

ابھی اس آٹے ساٹے کی سگائی کو چند دن ہوئے تھے۔ کہ گنجر والی سے خبر آئی کہ مرچی کو نوبت کا بخار آ رہا ہے۔ اسے فکر ہوئی کہ کہیں ہونے والی دلہن چل نہ بسے۔ اس نے اپنے باپ سے کہا۔

"بابا رے بابا اگر وہ مرگئی تو مجھے سب رنڈوا کہیں گے۔ دوسرا بیاہ ہوا تو میں دوہاجو بن جاؤنگا۔ میں تو گنجر والی جا رہا ہوں اسے پوچھ

کے آؤں گا۔

باپ :- بیاہ سے پہلے ساس سسروں کے گھر نہیں جایا کرتے۔

ماڑو :- نہیں بابا نہیں! چلے جایا کریں ہیں!

ماڑو نے لاٹھی چادر اٹھائے اور ظہر کی جماعت کے بعد گنجر وال روانہ ہوگیا۔ دھوپ اس وقت بھی بہت تیز تھی۔ حالانکہ سورج آکاش پر مشرق سے اتر چکا تھا، گیہوں کے کھیتوں میں جو گھموئی کھڑی ہوئی تھی تو اس کے کھٹے کھٹے زرد پھولوں کی رنگت آنکھوں میں چبھی جا رہی تھی۔ گھموئی کے کانٹے ماڑو کی پنڈلیوں اور ٹخنوں میں چبھ گئے تھے۔ لو کا یہ حال تھا کہ کھرسائی لگی، بالچرا تک سوکھا جا رہا تھا۔ راستہ میں جو خشک خونی ندی آئی تو اس میں ایک سگڑ رکا کھڑا تھا۔ اس کی سواریاں نیچے اتری کھڑی تھیں کیونکہ سگڑ کا ایک بیل گرمی کے مارے زبان نکالے گرم ریت میں بیٹھا ہوا ہونک رہا تھا۔ کنارے کھڑے ہوئے کیکر اس تیز ہوا میں سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کوئی کوئی بگولہ بھی گھومتا گھامتا پھر رہا تھا۔

جب ماڑو سسرال پہنچا تو مرچی اسے دیکھتے ہی زور زور سے گالیاں بکنے لگی۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ ہونے والا شوہر ہے۔ "اسے یہاں سے کاڑھو، اسے یہاں سے کاڑھو۔ یہ جھوٹی جاٹ کا سسرا ہے۔ ہتھوڑی لاؤ، میخ لاؤ۔ میں اس کے سر میں میخ ٹھونکوں گی، جس نے اسے نوتا ہوگا۔" (دعوت دینا) - مرچی نے اٹھ کر آلے سے ہتھوڑی اٹھالی، ماڑو سردل کے کولے سے لگا ہوا اسے مڑ مڑ دیکھ رہا تھا۔ جب مرچی اس کی طرف

پڑھنے لگی تو دوسروں نے اسے علیحدہ بیٹھنے کے لئے ڈیوڑھی میں بھیج دیا کہ لڑکی کو تبخیر ہو رہی ہے۔ یہ ہوش میں نہیں۔

ماڑو ڈیوڑھی میں جا کر گھموئی کے کانٹوں لگی پنڈلیاں اور ٹخنے سہلانے لگا ان میں جھاڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ دوکان سے میٹھا تیل لے آیا اسے مالش کرتے ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ جمن جاٹ اسے آ کر پوچھنے لگا۔ "کیسی ہے وہ؟"

ماڑو:۔ کیسی ہوتی، اچھی ہے۔

جمن جاٹ:۔ میں تو یو پوچھوں ہوں، اس کی بیماری کیسی ہے؟

ماڑو:۔ اسے تو خفقان ہو رہا ہے۔ اول فول بک رہی ہے۔

پھر اندر سے کوئی گھڑے اور بہنگی لے آیا کہ یا ہونا پانی لے آ۔ نئے جمن جاٹ اسے دیکھ کر اہر گیا۔ کنوئیں پر یہ دونوں پھر ملے کیونکہ جمن بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ یہاں ماڑو کو خبر لگی کہ اس کی ہونے والی بیوی کا سگا تر ایہ ہے۔ اسے جمن پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کی سمجھ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ جو جمن اس سے یارانہ نہ گانٹھتا تو اس سے اس کی شادی کیسے ہو سکتی۔

ماڑو سسرال کے گھر بلا پانی بھرنے لگا۔ مرچی اچھی ہو گئی تو وہ جیب بھگا وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ جیسے اس کی آمد مضحکہ خیز تھی۔ ایسا ہی اس کا دیر پا قیام تھا۔ مرچی اس سے بہت الکتا گئی تھی، کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا جمن کے پاس جانا بھاری ہو گیا۔ ایک دن ماڑو گھڑونچی کے چار گھڑوں میں سے دو گھڑے بہنگی میں رکھ کر چلا تو مرچی بولی:۔

"پا ہونے جی! اتا دو لے آنا۔ بڑی تس لگ رہی ہے۔

جب وہ بہنگی لے کر چلا تو مرچی اس کی اترائی ہوئی چال دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلوانوں کی طرح سے کندھے ہلاتا جھومتا لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ اس وقت ایسی گرمی پڑ رہی تھی کہ اسارے کے ٹین تک میں بھرا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ جب ماڑو نے واپس آکر دو بھرے ہوئے گھڑے گھڑونچی پر رکھے تو اس نے دو بھرے دو گھڑوں کو خالی پایا۔ اس نے پھر بہنگی سنبھالی اور یہ بھی بھر لایا۔ واپسی پر پھر پہلے گھڑے خالی نظر آئے۔ ماڑو اس طرح پھیرے پہ پھیرا کر رہا تھا اور مرچی اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔

جب دو پہر ڈھلا تو مرچی کی سوئی ہوئی ماں ہڑبڑا کر اٹھی اور پوچھا پاہونے کو کھانا کھلا دیا؟

مرچی:۔ پاہونا تو یہاں کوئی نہیں۔ ایک بھیڑا الڈو تو آیا ہوا ہے۔ وہ پانی بھرنے چلا گیا۔

ماں:۔ وہ تو میرے سونے سے پہلے گیا تھا۔

مرچی:۔ آڑھی بہنگیوں پہ بہنگیاں لا رہا ہے میں گھڑے رتا دوں ہوں۔ وا پھر چلا جاوے ہے۔

ماں:۔ کسی کو یوں تنگ نہیں کرا کرتے۔

مرچی:۔ سسرال کی دیکھ دو ہلہر ا بھی نہیں گھنڈ لا کرتے۔ یہ تو یہاں چھپا نقی ہی ڈال پڑا۔

اسی وقت ماڑو بہنگی لے کر آ گیا۔ اس سے بہنگی تک نیچے نہ

رکھی گئی ۔ کیونکہ وہ تنولا گیا تھا ۔ اس کی آنکھیں گویا بے ہوشی میں بند سی ہو گئی تھیں ۔ وہ گر پڑا تھا ۔ اور دونوں گھڑے پھوٹ گئے تھے ۔ مرچی کو اب بھی اس پر رحم نہ آیا بلکہ کلکلا کر بولی : ۔

" واہ رے بل دھاری ! اتنے کا پانی نہیں لایا ، جتنا نقصان کر دیا ۔"

پھر مرچی کی ماں ترس کھا کر اس کے پاس آ گئی ۔ اور ہونے والے جنوائی کا سر سینہ سے لگا لیا ۔ مرچی نے اسے فوراً شکر کا شربت پلایا ۔ ماڑو نے آنکھیں کھول دیں تو اس کی ہونے والی بیوی مرچی نے اپنی بت انگلی ہونے والے شوہر کی طرف کرتے ہوئے پھر کہا " ارے اوت پٹانگی ! اتنے کا پانی نہیں لایا جتنے کا نقصان کر دیا ۔"

ماڑو : ۔ میں تو سے دو نئے گھڑے خرید کے لا دوں گا ۔

مرچی : ۔ اچھا پا ہونے جی ، مونڈھوں کا کیا حال ہے ؟

ماڑو : ۔ سوجے جا رہے ہیں ۔

مرچی : ۔ تو گرڑ لا دو ں سینک کے لاؤں گی ۔

ماڑو : سینک کر نہ لائیو ، گرمی پڑ رہی ہے ۔

مرچی تو گرڑ بلا سکا ہوا تو نہ لائی لیکن اس نے اس پر نمک برابرایا ہوا تھا ۔ بجائے کندھوں پہ رکھنے تو ماڑو کے جھلاٹ ہی تو لگ گئی ، وہ ناچ

۱۔ تنولانا ۔ بے ہوشی وغیرہ میں آنکھوں کے سامنے کالا نظر آنا ۔

۲۔ کلکلانا ، غصہ میں بولنا ۳۔ بل دھاری : ۔ طاقت والا ۔

۴۔ بت انگلی : ۔ اشارہ انگلی ۔

سا گیا۔ مرچی کی ماں لوکر سٹاکر اس کے کندھے سہلانے لگی۔ مرچی نے اپنی آنکھوں میں شیطان بھر لیا تھا۔ اور وہ ہونٹوں ہونٹوں میں ہی مسکرا رہی تھی مادھو کو اس بے حیا شرارت میں بھی حسن شرارت نظر آرہا تھا۔ یہ لڑکی اسے بھونسر پر گھسیٹ رہی تھی۔ اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے پھولوں کی سیج مل گئی۔ مرچی نے ہونے والے شوہر کو بد بابا ہی نہیں تھا بلکہ اسے تو اس نے اپنی سہیلی کی سی لگادی تھی۔

مادھو مرچی کو خبر نہیں کیا سمجھنے لگا تھا۔ حالانکہ حسن صورت میں وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کا ماتھا تنگ تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور ایک دوسرے سے دور دور۔ اس کی ٹھوڑی نوکدار تھی۔ اور رنگ گھوسا کالا۔ اس کے مقابل مادھو کو بھنگی کے لطفہ سے سہی لیکن اس میں نمک سا تھا دیسے ان دونوں کی شادی بے جوڑ نہیں تھی۔

اور دور لگنے اور دھونی میں بہت فرق تھا۔ لڑکی کم عمر بے تمکنت بدنمائی کا سا وہم مزاج اور لاڈلی سی تھی۔ لگا ہیجڑا سا اور بدڈول تھا۔ لیکن چالاک اور کسیلا۔ اگر دھو میں شربت کا گھونٹ تھی تو یہ ٹھرا تھا۔ دھو میں ابھی تک واقعی اچھی طرح سے بر بچگے بھی نہیں ہو پائی تھی اور اس کا گونا اتنی کم سنی میں نامناسب اور خطرناک تھا۔ لیکن چونکہ شادی آنے سالے کی تھی۔ اور مادھو جلد از جلد مرچی کو لانے کی فکر میں تھا اس سے وہ رمضان کو نہیں روک سکتے تھے۔ پھر بھی یہ طے پا گیا تھا کہ جب تک ہیرا ان نہ ہو گا اپنی بیوی سے الگ رہے گا اور وہ دو چار دن میں

ہی ٹھہر کر میکے واپس آجائے گی۔

مرچی اور گلے کی نیتوں میں بڑا فتور تھا۔ یہ سوچے بیٹھے تھے کہ ماڑو اپنی دلہن کو صرف دو تین رات برت سکے گا۔ پھر یہ ہمیشہ کیلئے اپنے میکے چلی آئے گی۔ ان کا ارادہ یہ بہانہ کرنے کا تھا کہ جس مطلب کے لئے بیاہ ہوا کرتا ہے ماڑو نے تو وہ مطلب اپنی بیوی سے پورا کر لیا تو جب تلک دھومن سے مطلب برآری نہ ہو سکے گی اور اس میں برس کے قریب لگے گا۔ نہ مرچی لڑکی پاس اپنی سسرال جائے گی اور نہ دھومن کو میکے بھیجا جائے گا۔ ہاں دھومن کو لے جانے کا جب اختیار ہو گا جب وہ مرچی کی طرح سے پر تال بی گئی ہو گی۔ جب اس کے شوقین پورے نپٹانے کے لیے باپ کے گھر لوٹی سنے تو یہ بلا پٹار سے کیسے چھوٹ سکتی تھی۔

ماڑو ٹھیکرے کے بدلے گھڑے کو ہیرا دے رہا تھا۔ لیکن اسے خبر نہیں تھی کہ شاید ہیرے کے ساتھ اسے پتھر سے بھی ہاتھ دھونے پڑینگے۔ آٹے سانٹے میں ایسے پر پنچ ہوتے ہی رہتے ہیں، یہ مہا مہا پرپنچ تھا۔ اور پھر مرچی ایسی رنڈی تھی ساکھا خود لڑکی سے بھی امید رکھنی بھی چاہیے تھی۔

۲

ایک رات عشا کی نماز سے تھوڑی ہی دیر بعد گنجر والی کے بہت سے لوگ گھلّے کی ڈیوڑھی کے آگے گھیاری میں کھڑے تھے۔ گھر میں

، نئی دلہن دھومن نعرہ زور سے چلا رہی تھی۔ گلا اپنی شب زفاف میں تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے۔ ' مانا یہ میاں بیوی ہیں، پر وہ بچہ ہوئی اور یہ گولی بند جوان ہے' اندر دھومن بھی اپنے شوہر سے رو رو کر فریاد کر رہی تھی "اس میں تو ابھی ادانی ہوں، ادنی کی تو کوئی قربانی تنگ نہیں کرتا" پھر اس کے شوہر کی منطق بھی اپنی جگہ درست تھی، وہ جواب دے رہا ہے "تو نادانی ہے پر جو تیرے بدلہ ماں (ایں) لگی ہے (دادہ) تو ادنی نہیں یہ فیصلہ اپنے بھائی سے کر کے آنا تھا۔"

دھومن اپنا تن گلے سے بالکل نہ بچا سکی۔ جب گلے نے اسے چانپ چڑھایا تو اسے شوہر سے رہنا پڑا۔ وہ تو خوف کے مارے اب سانچے میں ڈھلی جا رہی تھی، گلا اسے یہ بھی سمجھائے جا رہا تھا۔ "ہمارا نکاح تیجی کا نکاح نہیں، تو نے وہ رسّے دیکھے ہوں گے جن پر سے جمنا کا جھنبولا چلے ہے۔ جھنبولے میں ایک کنارے کا آدمی دوسرے کنارے جا سکے ہے۔ اینٹھے تگڑے وہ رسے ہیں ان سے زیادہ تگڑا ہمارا بیاہ ہے۔"

جب دھومن کی کلکاریاں بند ہو گئیں تو وہ ٹھکر ٹھکر کر رہی تھی، لیکن ٹھکر ٹھکر کی آواز تو کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ تو لوگ یہ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ " میاں بیوی کے معاملوں میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔" دھومن بدلہ میں نہ آئی ہوتی تو اس پر رحم کھایا جا سکتا تھا۔ گلے کی مرضی تھی کہ اس پر چاہے جتنے زور سے آرا چلائے وہ اس کا ہاتھ نہیں

روک سکتی تھی۔

ادھر مرچی نے اپنے ہفتہ بھر کے قیام میں ماڑو کو شیشہ میں اتار لیا تھا۔ یہ پہلے ہی سے کھیلی کھائی تھی۔ اسے دھوبن اب جیسے سخت امتحان سے نہیں گذرنا پڑا تھا۔ یہ اپنے شوہر کی ایسی میٹھی پیاری بن گئی تھی کہ وہ اپنے بھاگ میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ مرچی اس سے ٹھٹول بھی کرتی تھی "میا نانا تا رہے کے ہچولن بھرے آیا۔"

ماڑو:۔ اور کیا۔ اور کیا۔

مرچی:۔ گگا پانی کو پال پوس کے جوان کرے گا۔ جب تک وہ جوان نہ ہو تو کبھی پھیرے دھورے نہ آ۔

گگے نے دھوبن کو شہت (شہد) میں نگائے کے رکھی ہو گی اور تو میری ہر گھڑی کی چھوڑ بازی کرتا ہے ہے۔

ہفتہ بھر بعد ماڑو اپنی دلہن کو سسرال لے کر چلا۔ گرمی اب بھی خوب پڑ رہی تھی۔ دھوپ ماسے بچاؤ کی خاطر بیل گاڑی پہ دوڑ اتا نا ہوا تھا۔ گاڑی میں ادرسے بھری ہوئی مشکی تھی جو ماڑو اپنی دلہن کے لئے لے جا رہا تھا کہ وہ لو سے کا ٹھ تینت پی لے۔ ستو بھی تھا اور پانچ مٹی کے گلاس بھی تھے۔ جن کی سوندھی سوندھی خوشبو مزا دیتی ہے۔ لونی باہر سے گنجر دالی تک کا سفر انہوں نے خوش خوش طے کیا۔ راستہ ہی میں خونی ندی آئی جس کا پاٹ ایک فرلانگ کا تھا اور جو اپنے کنارے کے دیہات کو اجاڑتی رہتی تھی۔ اس کی بھینٹ ہر سال کوئی نہ کوئی

انسان چڑھتا رہتا تھا۔ اس لئے اسے خونی ندی کہتے تھے۔ اس وقت یہ ندی نہایت ہی کس مپرسی کی حالت میں خانہ بدوشوں کے چھوڑے ہوئے چولہے کی طرح پڑی ہوئی تھی جو کبھی بھی آباد ہونے والا نہیں ہوتا۔ اس کے کنارے سونے تھے۔ یہ اشتباہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ برسات میں اس کی چنگھاڑوں سے بڑے بڑے شیر دل سو بھی نہیں سکتے ہوں گے۔ یہ مرا ہوا اجگر اژدہا ساون کی جھڑیوں میں دن رات پھنکارنے لگتا تھا۔

گنجبر دال یہاں سے دو فرلانگ تھا وہاں کی مسجد کا آدھے انڈے ایسا سفید گنبد اور سونے کے پھول والا کلس درختوں کی ہریالی میں معجزہ سا معلوم ہو رہے تھے۔

بیل گاڑی ڈیوڑھی کے پاس آکر رکی۔ ماڑو اپنی پہلوانہ چال دکھاتے ہوئے مٹکی ڈیوڑھی میں کود آیا۔ مرچی گاڑی سے کود کر اتری۔ اس نے اپنے شوہر کو ڈیوڑھی ہی میں بیٹھنے کو کہا اور فوراً ہی بھنگی سے آئی کہ جنوائی پانی بھرنے چلا جائے۔ اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ جب اس نے اپنی بیوی سے پانی مانگا تو اس نے منہ سکوڑ لیا۔ اور تڑک کر بولی "کنویں پہ پی لئے" اس وقت ماڑو کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خونی ندی میں ایک پاگل طوفان آگیا ہو۔ اب تک تو اس کی بیوی اچھی خاصی تھی اور ابھی اس نے کیوں غصہ میں آکر سیہہ کی طرح سے کانٹے کھڑے کر دئے تھے اور آنکھیں الو کی طرح سے دکھائی

شروع کر دی تھیں ساس کا تو یہ حال ہو گیا تھا جیسے وہ بیاہ کا لٹو بنڈک
ٹھنڈا کر دینے کو تیار ہو۔ اس نے اپنا منہ کیسا سکوڑا ہوا تھا۔ اور دلہن
اپنے بھائی کو ملنے کے لئے رو رہی تھی۔ لیکن اسے گھگھے نے ماں کے ڈر
سے رو کا ہوا تھا اور ایسا چپ کیا ہوا تھا کہ ڈیوڑھی میں آواز نہ جائے۔

مرچی کا رویہ اپنے خاوند کی طرف سے معاندانہ ہی نہیں بلکہ
تر اٹھا۔ وہ بات کرتے ہوئے سر توڑتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ گو یہ بات وکیہ
اس کا یہ کیسا برا تو لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی نشانہ تھنڈا ان کو ہی دلہن
کو گھر لے جانے کی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے اگر زیادہ چپ چپیتا
کی تو اسے چلغوزے کی طرح پرے پھینک دیا جائیگا۔ مرچی اسے دلہن
کے طفیل میسر آئی تھی۔ اور جب وہ اسے یہاں چھوڑ گیا تو پھر مرچی بھی
ہاتھ سے جائے گی۔ اس لئے وہ تھوڑی دیر تو منہ سا بنا بیٹھا رہا اور
پھر ٹھیو کا پیاسا بھنگی لے کر چلا گیا۔ اب اس کی چال پہلوانوں ایسی
اور جھومنے والی نہ تھی۔ وہ پہلے ہی کیطرح سے پانی بھرنے لگا۔

گھر آئے جنوائی کو شکرانہ کھلاتے ہیں ماڑو کو دو وقت بچی کی روٹی
ملتی تھی اور روٹی بھی باسی تباسی۔ مشکی کے پورے کا شربت سبھی گھر
والوں نے پیا مگر مشکی لانے والے کے ہونٹ شربت سے ایک
مرتبہ بھی تر نہ کئے گئے۔ دوپہر کو اس کا بسیرا ڈیوڑھی میں ہوتا تھا اور
رات گلی میں بسر ہوتی تھی۔ بیر تا ڈ اس لئے کیا جا رہا تھا کہ وہ جان
جائے کہ ہوا کس رخ چل رہی ہے۔

ماڑو کو دھومن سے ایک دفعہ بھی ملنے نہ دیا گیا۔ جب وہ اس کے لے جانے کے لئے تقاضا کرتا تو جواب دیتے اس کا تو یہاں جی لگ گیا ہے۔ وہ آپ نہیں جانا چاہتی۔

پہلے پہلے ماڑو کو یہ بھی کہا گیا کہ ابھی تک ساٹھے میں آئی ہوئی کے ساتھ مانک نے پھانکا پھانکی نہیں کی ہے جب تک گلا اپنی بندوق نہیں چلا لینے کا دھومن میکے نہیں جائے گی اور نہ مرچی کو سسرال بھیجا جائے گا۔ لیکن جب کئی لوگوں نے ماڑو سے شکایت کی کہ کل جگ ہے۔۔ کل بگ جوان ناتا لینے کی خاطر سگے بھائی نے اپنی ایانی بہن بیاہ کر بھیج دی ان کی پہلی رات کو سارا گاؤں جاگتا رہا اور سنتا رہا کہ جیسے چڑیا کے بچے کو دھڑا کو اپنجوں میں دبائے کھا رہا ہے اور وہ رچیں رچیں کر رہی ہے! اس کے بعد اس میں کوئی کلام نہ رہا کہ دھومن کے ساتھ اس کے شوہر نے پھانکا پھانکی نہیں کی اب یہ عذر تو باقی نہیں رہا تھا کہ جب تک گلا اپنی بندوق نہیں چلائے گا نہ دھومن میکے جائے گی نہ مرچی سسرال لیکن مرچی کے سسرال والے اب ماڑو کو خالی ٹرخانے پر تل گئے تھے۔

پھر مرچی کو جتنا ہوئی کہ ماڑو تو چیچڑ ہی بن گیا۔ وہ اسے ٹالنے کے جتن سوچنے لگی۔ ایک دوپہر ماڑو پانی کی بہنگی لے کر آیا تو ڈیوڑھی کے کواڑ بند تھے اور اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے کواڑ پیٹنے شروع کر دیئے۔ جتن جاٹ اسے دیکھ کر ہنستا ہوا گذرنے لگا۔ پھر اس کے کواڑوں

کے پاس پہنچ کر ذرا ہی دستک دی تھی کہ دھومن نے دروازہ کھول دیا وہ ڈیوڑھی میں پلنگ پر دوتہی بچھا رہی تھی ۔ مارٹو نے خوش ہو کر کہا :۔ آج تو تمہاری بڑی کھاطراں ہو رہی ہیں ۔ دوتہی بچھائی جا رہی ہے ڈھیر سے گھی بوُرے ، گھیورے کی برنیوں اور سونے کے ورق والا شکرانہ کھلایا جاویگا ۔

مرچی نے گول گول شیطانی آنکھوں میں غصہ کا کڑوا زہر گھول کر جواب دیا ۔ " بھوٹ کی طرف سے کھیل تیرے اوپر دوسری بپتا پڑنے والی ہے ۔ بالن نہیں تو اکیسے چڑھے ۔ جا کھرنی رخونی اندی پہ سے لکڑیاں چُگ لا ۔ "

مارٹو :۔ اتنی دور سے ایسی گرمی ماں ریں باہر نکل کے دیکھ ۔ آنکھوں کے سامنے تر مرے ہی تر مرے بھرنے لگیں گے ۔

مرچی :۔ تو تو آپ بھی بھوکا مریگا ساتھ ہمیں بھی مارے گا ۔

مارٹو :۔ اچھا جا رہا ہوں لوٹ کے آیا تو ٹھنڈا ہریرا پلاویگی ۔

مرچی :۔ پلاؤں گی ۔

مارٹو :۔ آہا میرے لئے کیسی چٹی دوتہی بچھائی ہے تھوڑی دیر اس پہ لیٹ کے دیکھ لوں ۔ (وہ بیٹھنے لگا تو مرچی نے ... زہر میں بجھی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اسے پرے ہٹاتے ہوئے بولی

مرچی :۔ ہٹ رے نکٹی کے جنے ! یہاں تو آج ماں سوئے گی

ڈیوڑھی ماں ٹھنڈ ہے۔

ماٹھو :۔ اور میں؟

مرچی :۔ میں کے گلے پہ چھری؟ یہاں تو وہ ہی سویا کرے تھی۔ اب تو جو آکے دھر اگیا۔ بتا وہ کہاں جاوے؟

ماٹھو :۔ تو میں چلا جاؤں؟

مرچی :۔ بڑی کھوسی (خوشی) سے۔

ماٹھو :۔ تو چل بھل۔

مرچی :۔ گھر جائیے میرے واسطے پالوڑا بچھوا۔ میں آجاؤں گی۔

ماٹھو :۔ پالوڑا کیا ہوتے ہے۔

مرچی :۔ کچھ ہو ہے۔ جمن جاٹ کے کتے کے کان پہ چپڑیاں ایسی چپٹیں، انگ ہی نہیں ہوں ہتیں پھر چمٹی پہ انگاریاں لے لے کے انہیں دکھائیں تو جب جا کے بنوٹیوں نے کتے کا پیچھا چھوڑا تھا۔

ماٹھو :۔ تو بڑی چنچائی ہے۔ میری پھبتی اڑا کے تجھے کیا مل جائے گا۔

مرچی :۔ تیری پھبتی تو بڑے بجار (بازار) ماں بھی اڑ رہی تھی۔ سارا گاؤں یوں کہے ہے گنگے کی بہن کو کوئی بر نہیں ملے تھا جو اس سقے کے پلے باندھ دی۔ پر یہ بھی سب کہیں ہیں بڑا گیندڑ اور سفنہ ہے سارے سارے دن جیٹھ کی دوپہریوں میں بھنگی اٹھاؤں پھرے

ہے۔ تھکتا نہیں۔

ماڑو:۔ ایک تو میں تمہارا پانی بھروں ساتھ سقہ بھی کہلاؤں۔ اب میں بہنگی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اب پانی اپنے بھائی سے بھروائے۔

مرچی:۔ اے تو وا جان کھائی تجھ سا نہیں چھوڑتی، دونوں ماں (میں) ہر گھڑی کاٹنے کی کشتی ہوتی رہے ہے۔ تال سے تال ملائے رہے ہیں تو کیسی تماشا جا دیکھو۔

ماڑو:۔ بے شرمی کی باتاں نہیں کرا کرتے۔

مرچی:۔ ہائے ہائے، میرے بھیا کو کیسی چھوٹی سی، چھیری سی کجوری سی گانوں والی، ہاتھ ایک سی لنکا ہو ملی ہے۔ عجیب مزے مزے سے کر کھاتا ہو گا تو چرمر چرمر بولتی ہو گی۔

ماڑو:۔ چپ رہ ڑبدلی چپ رہ!۔

مرچی:۔ وہ چپ بھی نہیں رہتی اسے تو بھولی باتیں کر کر کے اپنے لونڈے کا بھیجہ چاٹ لیا۔

ماڑو:۔ میرا بھیجا نہ کھا۔

مرچی:۔ تو میرے دانت دینا چاہے ہے؟ میں تیرے منہ بند چڑھا دوں گی۔

ماڑو:۔ میں تیرے کھبوڑے منہ میں ہاتھ گیر کے کانوں تک پھاڑ دوں گا۔

مرچی:۔ جو میرے حمایتی آگئے تو تو اپنا پو تجھڑا دونوں ٹنگڑیوں میں دبائے کے چھل چھل موتتا ہوا بگٹٹ بھاگے گا۔ وہ تیرا پیچھا کھونی ندی تک کریں گے پھر تیرا پیچھا چھوڑ دیا جاوے گا۔

ماڑو :- اب میں ضرور تجھے گیل لے کے چلوں گا، نہیں تو دھومن میری گیل چلے گی۔

مرچی :- وا کیوں چلے گی؟

ماڑو :- آٹا ساٹا جو ہوا تھا۔

مرچی :- جو وہ آپ نہ جانا چاہے؟

ماڑو :- وہ کیسے نہ جانا چاہے، وہ تو تیرے بدل (بدلے) آئی ہوئی ہے میں اسے لے کے جاؤں گا۔

یہ سنتے ہی مرچی نے اپنے شوہر کی چادر لاٹھی کواڑ کھول کر گلی میں پھینک دی۔ ماڑو انہیں اٹھانے گیا تو مرچی نے اندر سے کنڈی مار لی۔ ماڑو نے بہتیرے کواڑ پیٹے۔ لیکن اس کی بیوی نے دروازہ نہ کھولا۔

ماڑو اس ہتکِ شبلیگی پر بھی بیوی کا در چھوڑنے کو تیار نہ ہوا۔ اس کی بے شکیبی بہت ہی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ جو مرچی نے کچھ دن سسرال میں میٹھی پیاری بن کر اسے شرف بخشا تھا تو اسے وہی گھڑیاں یاد آتی رہتی تھیں۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ دھومن باوجود ادنیٰ ہونے کے نگام دار ہو چکی ہے۔ اس کی سسرال والے بدعہد تھے۔ انہوں نے دھومن کے معاملہ میں اس کا ثبوت پیش کر دیا تھا۔ اب مرچی بدمہر اور چیپر سی ہو گئی تھی۔ وہ جوں توں کر کے اپنی بہن کو لے جانا چاہتا تھا اور مرچی کو مجبور کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے گھر آ کے بسے گی تو جب ہی گلے کا بھی گھر آباد ہو گا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ مرچی کو بڑا ہوتا جمن جاٹ

تو پسند آ۔ یا تھا۔ اور وہ سادہ صورت باڑو کے ساتھ بے تال تھی۔

باڑو نے ذرا حلیمی دکھاتے ہوئے کہا "اتنی ٹیکھری نہ بن۔ تو میرے سانڈھ بندھ رواڑے بھر ایک چھپر تلے رہ چکی ہے۔ جب تو ٹوٹڑی ادھیپن دکھائی دے رہی تھی اب تجھے کیا بادل مار گئی۔"

مرچی :۔ بادل تو اسے مار گئی تھی جسے جھوٹڑے بھگالے گئے تھے۔ اچھا یوں بتا دا آپ بھاگی تھی یا موسوا سے بھگا کے لے گیا تھا؟

باڑو :۔ کیوں بتاؤں۔

مرچی :۔ یہ تو بتا دیا تو تیرے ساتھ بھی تو چلی جاؤں گی۔ اچھا نہیں بتاتا؛

باڑو :۔ کیوں بتاؤں؛

مرچی :۔ ارے جھوٹے بتا دے وہ مجا (مزہ) دونگی مجے ماں اتنا گڑ گڑ ہو جاوے گا۔ دیکھ میں کیسے مٹھا سے بول رہی ہوں میری بات کا جواب دے۔

باڑو :۔ نہیں دیتا جو چاہے کر۔

مرچی :۔ تو جواب نہیں دیتا، میں جباب (جواب) دوں گی۔ میں تیرے باپ کو دیکھا ہے۔ جب وا یہاں آیا تھا، وا تو چھلا ہے جبھی تو تیری ماں سپوڑھے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

باڑو بڑی اکڑ کے دار دھوپ میں میز بالوں کے لئے بالن چگنے

چلا گیا - اس وقت ہوا گرم تھی - پرواسی ٹھنڈے پنڈول بھرے کوٹھوں میں سو رہے تھے - بھینسیں سرورج والے تالاب میں بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھیں - اس تالاب کے کنارے جھمن جاٹ کا مکان تھا - جس کی کھڑکیاں پانی کی طرف کھلتی تھیں - جب ماڑو مکان کی طرف سے گذرنے لگا، تو جھمن جاٹ کی گھوڑی ہنہنانے لگی کیونکہ اس کا مالک توبے میں اس کے لئے دانا لا رہا تھا - گھوڑی تو ہنہنا رہی تھی - جھمن بھی اس کے ساتھ ہنہنا رہا تھا - اس آواز پر ماڑو کو خیال آیا کہ جس طرح گھوڑی اس جاٹ کو دیکھ کر ہنہنا رہی ہے، مرچی اور اس کا لنگما ترا بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر یونہی ہنہناتے ہوں گے انہوں نے تو گلے کو کنوارا نانا دیا تھا - لیکن اس کی بیوی تو جاٹوں تلے دبکی چال چل چکی تھی

ماڑو نے دھوپ سے بچاؤ کے لئے سر پر چادر رکھی ہوئی تھی - تپش کے کارن اسے درختوں کے پتے تک سفید نظر آ رہے تھے - اور زمین ایسی لگ رہی تھی جیسے خونی ندی کا ریت -

ندی کنارے جھوا جنڈ، پھرانس اور کریل ایسے بے سلاخ، سخت جان اور بے حیا درخت کھڑے ہوئے تھے - ان کے ٹرے پن سے دھوپ اور طوفان دونوں عاجز تھے - جتنی دھوپ پڑتی یہ اور اکڑتے، اور جب خونی ندی کناروں پر چڑھ کر گاؤں اجاڑتی تو یہ پانی میں ڈوبے رہتے - جب پانی کناروں سے اتر جاتا تو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تلنگوں کی طرح سے اکڑتے اور سانولاتے - یہیں سے ماڑو نے سوکھی لکڑیاں،

تورڑیں اور چنگیں اور سہرے پوپے کے جوٹنے میں بوجھی باندھ کر سسرال
دوار سے لوٹا۔

اس وقت ظہر کی اذان ہو رہی تھی، جب ماڑو نے میز بانوں کے
کواڑ چھیتنے شروع کیے۔ اندر سے مرچی بول رہی تھی "بہن کے گھر بھائی کتا
بلکہ للینڈی کتا ہے"

ماڑو :۔ تو تو میری گیل نہیں چلے گی ؟

مرچی :۔ جونڈے پہ بیٹھا میری باٹ دیکھتا رہیے، سایئد (شاید)
آجاؤں۔

ماڑو :۔ تو مجھ سے یونہی مچھت (مفت) ماں پانی بھرواتی رہی ۔
میرے کاندھے سُوج گئے ۔ تو نہیں جاتی تو میں دھوبن کو لے کے جاؤں
گا ۔

مرچی :۔ لے جا رے لے جا، پر دیکھ وہ تو اپنے ننبیرڑ سے پوری طرح لگ گدہ
گئی ہے اس کے تو پیٹ میں بھی پڑ گیا ۔ نام کی ننی، اٹھائے جائے دھنی ما
دیکھت ماں سوئی ہے، بھتیرے کوئی ۔ میں تو کچھ مہینوں ماں بھیجے والی
ہو جاؤں گی ۔

ماڑو :۔ تمہارا وعدہ تھا ۔ جب تک واجواں نہ ہو گی گلا ٹرکا رہے گا ۔

مرچی :۔ گلا کیا رکتا وہ آپ ہی نہ رکی اور رک بھی جاتی تو بلا برتے
یونہی رہتی تو بیچھوند نہ جاتی، اس کی ماں نے تو چوڑے تک نہ چھوڑے سے
وہ کس طرح اسے چھوڑ دیتی۔ پھیر میرا بھائی بھی کھنجڑی بجانے لگا ۔ تو نے

کبھی ان دونوں کا کھلکھلا نہیں سنا ؟

ماڑو :۔ مجھے تو کبھی وھومن کی آواج (آواز) تک نہیں سنائی پڑی۔ جو میں میرے گھر نہ بسی ہیں اسے کبھی یہاں نہیں بسنے دونگا۔

مرچی :۔ وا (وہ) اپنے کھاوند (خاوند) سلامت کی بدوں اجاجت (اجازت) تیرے ساتھ نہیں جائے گی۔ تیرا کھوچڑپن ان کی ملنساری کو نہیں توڑ سکتا۔

ماڑو :۔ میں اس کی گردن مروڑ دونگا' وا پہیلے (پہلے) مہاری ہے پھیر کسی ہرر (اور) کی، اچھا یوں تو بتا تیں کیوں میرے ساتھ نہیں جاتی۔

مرچی :۔ ہیں تیری گیل جب جاتی جو میں کوڑھن ہوتی۔

ماڑو :۔ جب کیوں جاتی ؟

مرچی : پھر لوگ کہتے، رام ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی۔

ماڑو :۔ میں کوئی اندھا ہوں ؟

مرچی :۔ کوئی آنکھوں کا اندھا کوئی ہے کا اندھا جو تو اب اس گھر ماں پڑنے کی کوشش کی تو مارے کھونسڑوں کے سر ہرٹے کے ڈنڈرا لیا ہوجائیگا۔

ماڑو :۔ تو تم وھومن کو کتر بھید سے بیاہ کر لائے تھے۔ تم نے ہمیں کھوب (خوب) روندا۔ ہم نے بہن کی بہن دی۔ ساتھ کھونسڑے کے کھونسڑے کھاویں گے۔

مرچی :۔ اگر دھنتے ہیں تیرے سر ہاں کھونسڑے سر ٹے ہوئے جوڑے

ماں بھگو بھگو کے ماروں گی۔ تیرے بر ہمانڈ ماں گل میکھ ٹھو کونگی تیرا رہائ یہاں کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا۔

ماڑو :۔ میں دھومن کو لے کے جاؤنگا۔ جب تو مجھے چھوڑ رہی ہے دھومن کو بھی اپنا کھانا نہ چھوڑنا پڑے گا جو وہ نہ گئی ہیں اس کی لھاس (لغش) یہاں چھوڑ کے جاؤنگا۔

اب ماڑو نے جوتے سے لکڑیاں نکال نکال کر گواڑوں پر مارنی شروع کر دیں۔ گاؤں والے جمع ہو گئے کوٹھے پر کھڑی ہوئی اس کی بہن کہہ رہی تھی " بھائی یہاں سے چلا جا۔ میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی "۔ یہ الفاظ اس کا شوہر اسے ڈرا کر کہلوا رہا تھا۔ اب ماڑو نے اپنی بہن کے مارنے کے لئے کوٹھے پر بھی لکڑیاں پھینکنی شروع کر دیں۔

پھر ڈلیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ مرچی اور اس کا بھائی باہر نکلے۔ وہ گلیاری ہیں بکھری ہوئی لکڑیاں اٹھا اٹھا کر ماڑو کے مارنے لگے۔ کوٹھے سے مرچی کی ماں لکڑیاں اور ڈھیلے اس کے مار رہی تھی۔ اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی بہن ایسا کر رہی ہے۔ پھر گلا اور ماڑو گتھم گتھا گھونسا ہو گئے۔ اس کے بعد ماڑو نے اپنے سالے بہنوئی کی کھینچی کھینچ کر تپتی گلیاری میں ڈھا دیا۔ گلے کی باری اوپر آنے کی کبھی نہ آسکتی تھی کیونکہ یہ چھپکلو سا تھا اور ماڑو گینڈا ۔ ان نے جھینپے ایسا۔ لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے۔

پھر گمیا چھینٹ بھر میں مرچی ہتھوڑی اٹھا لائی اور اس نے اپنے

شوہر کے سر پر مار کرنے شروع کر دیئے۔ ماڑو چوٹوں سے بلبلا اٹھا۔
وہ پھر بھی مارتی ہی جا رہی تھی۔ اب گلّا مہمان کے اوپر آ کر اس کی گدی
بچا رہا تھا۔ ماڑو کے بال اور گردن خون سے لال ہو رہے تھے۔
اتنے میں دھومن بھی آ گئی جس نے نند کے ہاتھ سے ہتھوڑی چھیننی چاہی۔
مرچی نے اسے ڈیوڑھی میں دھکیل دیا جہاں دھومن نے اپنے ناخنوں
سے نند کے چہرے کی کھال ادھیڑ دی تھی۔ اور مرچی نے دھومن کا
ہاتھ بری طرح مروڑ دیا تھا۔ پھر مرچی اندر سے گل میخ لے کر گلیارے
میں آ گئی۔ اس نے دھومن کو روکنے کے لئے باہر سے ڈیوڑھی کا کنڈا لگا
دیا تھا۔

جب مرچی نے اپنے شوہر کے سر میں ہتھوڑی سے گل
میخ ٹھوکنی شروع کی تو وہ اس طرح سے اڑانے لگا جیسے پولیس
تھانگی کو مار مار کر چوری کے مال کا پتہ پوچھ رہی ہو۔ دھومن اپنا
سر کواڑوں میں دے دے کر مار رہی تھی اور رو رہی تھی۔

لوگ ماڑو کو چھڑانے لگے اور کسی نے مرچی کے ہاتھ سے ہتھوڑی
بھی چھین لی تو وہاں جمن جاٹ آ گیا۔ اس نے پھر ہتھوڑی مرچی کے ہاتھ میں
تھما دی۔ اب وہاں مسجد کا پیش امام بھی پہنچ گیا۔ اس نے مرچی سے
ہتھوڑی لے کر گاؤں کے گوڈوں پر دور پھینک دی اور گلّو کو ماڑو
کے اوپر سے ہٹا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ماڑو کو ہوش آ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مرچی

اس کی چادر اور لاٹھی لے آئی ۔ وہ چادر سر پہ رکھے لاٹھی ٹیکتا ہوا اس ٹنڈ کی طرح سے جا رہا تھا جس کے پیر سوچ کر ان میں پانی پڑ گیا ہو۔ مرچی اسے سنا رہی تھی۔ دیکھو! پچھیت یوں چلا کریں ہیں۔" پھر وہ ٹھسکا دکھاتی ہوئی ڈیوڑھی میں چلی گئی ۔

۳

لوئی پاس پہنچ کر ماڑو نے اپنی بپتا باپ کو سنائی تو وہ رونے لگا باپ کو اس سے زیادہ تکلیف ہوئی کہ دھومن نے جیسے ابھی اچھی طرح سے اوڑھنی اوڑھنا بھی نہیں آتا تھا جو اس کی اتنی میٹھی پیاری بنا کرتی تھی ۔جس کا منہ اسے "بڑے بھائی" کہتے ہوئے سوکھا کرتا تھا اس نے اپنے بھائی کی طرف سے کیسی آنکھیں پھیر لیں ۔ اس نے تو کوٹھے پر کھڑے ہوئے بیچارے بھائی کے لکڑیاں اور ڈھیلے تک پھینک پھینک کر مارے تھے اور اسے کہا تھا "یہاں سے چلا جا" میں تیرے ساتھ نہیں جانے کی"۔ بھائی اتنے دن وہاں پانی بھرتا رہا، لیکن بہن نے اس سے نہ کبھی بات کی، نہ کھانے کو پوچھا ۔جب اس کے سر پر ہتھوڑے پڑ رہے تھے اور منخ ٹھو کی جا رہی تھی دھومن نے یہ تک نہ کیا تھا کہ اپنی نند کا ہاتھ ہی آ کر پکڑ لیتی ، جب پڑوس جمع ہوا ۔ اور وہ بہو کو پوچھنے لگے تو ماڑو نے پٹ سے کہہ دیا ۔"وا تو بڑے رجلے

نکلے، دھومن کو بھی رکھ لیا، پھر بھی کوئی نہیں بیٹھتے۔

جس طرح سے شہاب الدین غوری کو پرتھوی راج کے ہاتھوں شکست کا احساس رہتا تھا اور جب تک اس نے تراوڑی کے میدان پر پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ کو شکست نہ دیدی وہ چین سے نہ بیٹھا، یہی حال ماڈھو کا تھا۔ اسے ہر وقت اپنے سر میں میخ سی کھٹکتی ہوئی معلوم ہوا کرتی اور دھومن کا یہ فقرہ "یہاں سے چلا جا، ہم تیرے ساتھ نہیں جاتے گی" اس کے دماغ کو مختل کئے رکھتا۔ ان کی چھوٹی سی چھپری کی جنبش کو تو ایک ہی سانس دن رات پرت پرت کر اڑتی ہوئی لڑھیا بنائے دے رہا تھا۔ اور اسے اتنی حیا تھا کہ جھنگلوں تک لگانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اس کے ہر وقت کی نسبت سے ہی مارنے کو تیار رہتی تھی۔ نہ اسے کبھی فسنگ کا کھانا دیا تھا، نہ ڈھنگ کا بچھونا۔ اس نے کلیاری میں جاگ جاگ کے کتنی راتیں اس کے انتظار میں کاٹی تھیں۔ لیکن اسے دن بدن جنون ہی چڑھتا گیا تھا۔

ایک مرتبہ ماڈھو پنجاب کے کسی شہر میں گیا تھا۔ وہاں طوائفوں کو شہر سے نکالنے کی تحریک چل رہی تھی۔ عوام نعرے لگا رہے تھے۔ "ہن کنجریاں نوں شہر وچ نئیں رہن دیاں گے۔" ماڈھو دل ہی دل میں ہر وقت یہی نعرہ لگاتا رہتا "اب دھومن کو وہاں نہ رہنے دونگا۔ اب دھومن کو وہاں نہیں رہنے دونگا" اس نے یہاں تک ٹھانی ہوئی تھی۔ کہ جب وہ اسے ساتھ نہ لا سکا تو اس کے پیران چھڑا کر آئے گا۔

ماڑو نے اپنے ارادوں کی بھنک اپنے باپ کے کانوں تک نہ پہنچنے دی کیونکہ وہ اپنی لڑکی سے بہت پیار کرتا تھا۔ ماڑو کو بھی اپنی بہن سے الفت تھی بار بار وہ سمے یاد آنے لگے جب دھومن بچپنے میں دبلی اور کمزور سی لڑکی تھی۔ یہ اُسے خطا پر مارتا تو وہ مار سہتی اور روتی تھی، کسی سے شکایت نہ کرتی، مشہور ہے کہ کوئی اوائل طفلی میں کیسی ہی نحیف ہو شباب کو چڑھ کر لیس کی بڑیا بن جاتی ہے۔ دھومن نے ابھی شباب کی ڈیوڑھی میں آدھا قدم رکھا تھا لیکن وہ بدستور دیسی ہی تھی۔ کونپل گری سی، عناب کے پتوں کی طرح سنے سرنگوں سی، حلم پرور سی، کاغذی اور ابلا، وہ اس طرح سے پھونک پھونک کے قدم رکھ کر چلتی تھی جیسے اس نے ہوائی چپل پہنے ہوئے ہوں۔ میکے والوں میں وہ میکے والوں کی آگیا میں تھی۔ اور اب سسرال والوں کے تصرف میں۔ ماڑو کو اپنی بہن کی اس طبیعت کا احساس نہیں تھا۔ وہ ایسی گائے تھی جو قصائی کے آگے کھیلے تک بلا ہانکے جائے۔ اس لئے بھائی کو یہ صاف سجھائی دے رہا تھا کہ گگّے سے بدلہ لینے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ جس طرح سے اسے مرچی سے محروم کر دیا گیا تھا وہ بھی اپنے دشمن کو دھومن سے محروم کر دے۔

اساڑھ کا چاندنا پندھرواڑہ ختم ہو کر اندھیر پکھ چڑھ چکا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی، زمین سے شعلے نکل رہے تھے۔ بستیوں سے باہر عید گاہوں میں بارش کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھی۔ بہت سے

پیڑ خشکی کے مارے سوکھ گئے تھے اور آموں کی امیاں ٹھگر ٹھگڑ کر گر رہی تھی۔ جب مادھو ایک تیز کلہاڑی سنبھال کر گنجر والی چلا کہ دھومن کو قتل کر کے سسرال سے اپنی محرومی کا بدلہ لے۔

جب وہ غلام غفار خاں کے باغ کے پاس پہنچا جو موضع محی الدین پور کے نکال پر تھا تو اتر سے اٹھتے کالے گھنگھور بادل کے پہیے آسمان کی بانت بھرتے ہوئے آگئے۔ ہوا کی لہیں ڈوری ان سے پہلے ہی آگئی تھی۔ گھیرے کی دوب چگتے ہوئے مویشی آمد طوفان سے ڈر کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ گھاتی گیدڑوں نے تالاب کنارے کھڑی ہوئی بطخوں میں سے دو کو پکڑ لیا تھا۔ یہ پکڑی ہوئی بطخیں اور دوسری بطخیں زور زور سے چلا رہی تھیں۔

اس وقت مادھو کو دھومن یاد آگئی کہ جس طرح سے بطخیں گیدڑوں کے زخموں سے چور ہو کر چلا رہی ہیں، اس کی چھوٹی بہن کلہاڑی کے زخموں سے اسی طرح چلائے گی۔ پھر یک لخت اس کا سر پیڑنے لگا جس پر صرف دھومن کی وجہ سے ہتھوڑیاں پڑی تھیں مارے۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے سر میں اب بھی گل میخ ٹھک کی جا رہی ہو۔

پھر وہ سوچنے لگا کہ جب رات کو گھنگھور برسینگے، بگ ٹٹ بہتے ہوئے ندی نالوں نے شور مچایا ہوا ہوگا۔ کھنکھسکے زور سے پیڑ ننھے ہوئے جا رہے ہوں گے۔ برسات کی گنجار سے خونی ندی کے کناروں والا ہر گاؤں جاگ رہا ہوگا کہ کیا خبر کب طوفان کا پانی بن بلائے مہمان کی طرح

بے ورساں گھوڑوں میں گھس آئے تو ایسے میں گلّا تو اپنی بیوی کو لپٹا رہا ہو گا۔ مرچی جمّن جاٹ کے ساتھ سورج والے تالاب پر رتھان میں اینٹھا رہی ہو گی۔ اور وہ خود اسی گلیاری میں بھیگتا پھر رہا ہو گا جہاں اس کے سالے بہنوئی نے اس کی درگت کی تھی اور دھومن نے کوٹھے پر کھڑے ہوئے یہ ماجرا تماشے کی طرح دیکھا تھا۔

عشا کے دو گھنٹے بعد ماڑو گُنجر والی کے مدخل پر موجود تھا۔ اس مدخل کے شمال میں کچی سڑک کے جنوبی کنارے ایک باغیچی تھی جس کے حاشیے میں پٹ بیجنے کھلملا رہے تھے۔ سورج والا تالاب اور جمّن جاٹ کا رتھان بھی اسی طرف تھا۔ اس رتھان کی دو کڑیا ہال نما ڈیوڑھی میں گیس کی لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ گاؤں والے جمع تھے جمّن جاٹ ہونگ، نامہ نصیبر ڈھولک کی تھاپ پر لطیف آلہا پڑھ رہا تھا۔ کئی سننے والے جنگلی حال میں ناچ کود رہے تھے۔ ماڑو نے پیاؤ کی چھپریا میں ہی کھڑے ہوئے ایک پتھر گیس کی لالٹین پر پھینک کر مارا جس سے لالٹین ٹوٹ گئی اور مجمع درہم برہم ہو گیا۔

اس کارستانی کے بعد ماڑو گاؤں میں داخل ہو گیا۔ برسات کی رات گنجار رہی تھی۔ سوائے پٹ بیجنوں کی کھلتی مندتی روشنی کے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مگر گھٹاؤں کے جھونک میں بجلی بار بار جھلملا رہی تھی۔ گلیاروں میں کہیں ٹخنوں تک تو کہیں گھٹنوں گھٹنوں تک پانی ہلوریاں سی لیتا ہوا چل رہا تھا۔ بارش ہلکی ہلکی ہو رہی تھی۔

پھر ماڑو سسرال کے دروازہ پہ پہنچ گیا تھا۔ اسے اندر جانے کی کوئی سبیل سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ یک لخت گویا جادو کے زور سے ڈیوڑھی کے کواڑ کھل گئے۔ اس کی بیوی چمن جاٹ کے پاس جانے کے لئے گھر سے نکل رہی تھی۔ ماڑو نے اسے دروازہ ہی میں دبوچ لیا اور ڈیوڑھی میں بچھی ہوئی چارپائی پہ لے جا کر اس کی پامالی کر دی۔ یہ رضامندی کا معاملہ نہیں تھا۔ مرچی پھڑپھڑا رہی تھی اور ماڑو چنگھاڑ رہا تھا۔ جبھی کھلے کواڑوں میں سے کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ چمن جاٹ اپنی محبوبہ کو لینے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ اب باہر بڑے ہی زور سے بارش شروع ہو گئی تھی۔

چمن جاٹ نے جو ٹارچ کی روشنی میں گھمسان سا ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے ماڑو کی کوکھ میں بڑے زور کے ساتھ کھونڈی کی طرف سے لاٹھی کی کھونڈیاں مارنی شروع کر دیں۔ ماڑو چوٹ سے بلبلا اٹھا اور مرچی بھی نجات پا کر پاس ہی کھڑی ہو گئی۔ چمن جاٹ اور مرچی دونوں گھوڑی کی طرح سے ہنہنا رہے تھے۔ پھر چمن اور مرچی نے ماڑو کو بارش میں دھکیل دیا اور کنڈی بند کر کے الول کلول میں مشغول ہو گئے۔

ماڑو باہر گھپ اندھیرے میں بھیگ رہا تھا جو پانی سے بھری ہوئی چل رہی تھی۔ پانی اس کے گھٹنوں تک آرہا تھا۔ بارش کے شور میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ جب پانی ٹھہر گیا۔ تو کواڑ کھلے چمن جاٹ مرچی کو اپنے رتھان سورج داسے تالاب کنارے لے جا رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے

کواڑ اب صرف ڈھکا دیئے گئے تھے۔

مارڈو آیا تو وہ کلہاڑی لے کر اپنی بہن کا خون کرنے لیکن اس نے جمع اپنی پیا ہتا کی ترکی تمام ہوتے دیکھی تھی تو اسے سخت اشتعال ہو گیا تھا۔ اس لیے گھنٹہ بھر تک بڑے زور کی بارش اپنے سر پر لی تھی۔ اس سے جب بیسوا اور لگماز ا باہر نکل کر تھوڑی سی دور چلے تو مارڈو نے بجلی کی چمک و تک روشنی میں جتن جاٹ کی گدی پر کلہاڑی کے کئی وار پے در پے کیئے اور گردن دھڑ سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مرچی شور مچا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ لوگ جمع ہوتے مارڈو نے اپنی بیوی پر بھی حملہ کر دیا۔ وہ اپنے شوہر کی کلہاڑی سے ایسی شدید زخمی ہوئی کہ اسے اٹھا کر لے جانا پڑا۔

اس افراتفری میں دھرمن بھی گھر سے غائب ہو چکی تھی۔ اس کا شوہر اسے بستر میں تنہا چھوڑ کر بہن کی مدد کو بھاگ آیا تھا۔ پھر ان دونوں بہن بھائی کی بابت کسی نے کچھ نہ سنا۔

باجے والا

جاڑے نے پسپائی شروع کر دی تھی۔ شفتالو ناشپاتی کے پیڑوں پر پتہ تو نہ تھا۔ لیکن شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ شیام نہر کی پٹڑی کنارے سیمل پھول رہا تھا اور برساتی ندی کے شرق میں ریت کے سفید سفید تودوں سے آگے ڈھاکہ۔ ساڑھی پکانے والی خشک اور تیز ہوا جھکورے مارتی گرد اڑاتی دن دن بھر چل رہی تھی۔ آموں پہ بور آنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈیک پر سوکھی ہوئی نمکولیوں کے گوشے ہرے ہرے تازہ تازہ پتوں اور سفید پھولوں میں عقد ثریا کو مات کر رہے تھے۔ پلکھن پہ سرخ پتوں کی بہار تھی ننگی ننگی سرسوں کی زرد زرد خشک ٹہار اور لمبی لمبی پھلیوں سے شیطانی جھنجھنے بج رہے تھے اور ایسے وقت میں موضع کندن والہ کے سابق نمبردار کی بیٹی نساء کو قدرت کی یاد آ رہی تھی کہ "آئے ہائے ربّ میرے جی! جب میں نے اُنتوں پہلوں پہل دیکھا تو اس کے اوپر والے ہونٹ پہ بالوں کی یوں ہی تھوڑی سی کالک ہو گی۔ جو کوئی اوّل اوّل پاپ کرن لاگے تو اس کے دل پہ بھی ایسی ہی سیاہی رمکنے در مٹنے دمکنے لگتی ہو گی۔

اب سے آٹھ سال ہوئے بیساکھ کا مہینہ تھا اور کندن والہ میں، مسندر پور سے چپڑ ہاسرٹ بنیئوں کی بارات آئی ہوئی تھی جس میں رتھوں بہلیوں اور ہاتھی کے ساتھ انگریزی باجہ بھی تھا۔ انہیں باجے والوں میں سے قدرت کے ہاتھوں میں ایک لمبی کالی نفیری تھی، جب وہ اسے بجاتا تو اس کے گال جن پر ابھی بال نہ تھے کچھ فقوڑے سے پھول جاتے اور گھگرے ساڑھی پہننے والی بنیئوں کی لڑکیاں مندر مسجد چھوڑ کر اس گاؤں کی واحد پکی عمارت کرتا سیٹھ کی چوباروں والی حویلی پہ کھڑی ہوئی پہلے تو سوچتیں کہ وہ پیپنی بھی بار ہی بار سے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر مست ہو ہو کر ہل ہل کے بجاتے اور کہتیں "اے سکھی! یہ پیپنی کہاں سے آیا" اور اس کے پھولے پھولے گالوں پہ ہاتھ کی ہتھیلی ہتھیلیاں مار مار کے ٹھہر کالیں، پیپیا پیپیں پیں، پیپیں پیپیں پیں، بنیئوں کی ساڑھی گھگرا پوش لڑکیوں کے پاس ہی نمبردار کی بیٹی نساء بھی کھڑی تھی۔ جو یہ بانی کا لفظ لے اڑی، پیں پیں پیں۔

اور سکھی نانی کی چرچری چھوکری بھاؤ بتاتے ہوئے ٹھمک پر گانے لگی ــ

بانکی رے بانکے مجھے تیری چاہنا

تیری چاہنا میری چاہنا، تیری چاہنا

بانکے رے بانکے تجھے میری چاہنا

میری چاہنا میری چاہنا میری چاہنا

آ ہم دونوں نین ملا دیں

ہاتھ ملا کے گات ملا دیں

گات ملا کے من ، من من من ،

بانکے رے بانکے مجھے تری چاہنا

بانکے رے بانکے تجھے میری چاہنا

میری چاہنا میری چاہنا میری چاہنا

بانکے رے بانکے تجھے میری چاہنا

مجھے تری چاہنا تجھے میری چاہنا

نسا پیں پیں کرتی ہوئی گھر لوٹی تو اس کی ماں نے پوچھا "ہے وحدت! یہ کیا چڑیوں کی طرح بول رہی ہے؟" اس نے اس کا جواب بھی پیں پیں سے دیا

سندرپور سے آئی ہوئی ہوئی چھ رام مٹ بنئیوں کی بارات گنڈارا والے ہیں رات کی رات ٹھہر کر لگلے دن دو پہر بعد رخصت ہونے والی تھی عشاء کی نماز کچھ دیر ہوئے ہو چکی تھی جب نسا کا متبر ابائی خمول قسمت کو لئے ہوئے گھر آیا۔ نسا ان دنوں فاختہ کے اس بچے کی طرح تھی جس کی گردن کے کچھ کچھ بال پر برابر ہونے سے رہ گئے ہوں اور چونچ ابھی تک صاف نہ ہوئی ہو۔ قدرت نے باجے والوں کی وردی پہنی ہوئی تھی جس میں وہ نسا کو بھانیدار سا معلوم ہوا تھا۔ وہ اس کے بالکل نزدیک آکر شرارتی آنکھیں نچاتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں پیں پیں پیں پیں پیں پیں، پیں۔" کرنے لگی۔ ترشے ترشے ہونٹوں سے ادا ہوتے

ہوئے یہ الفاظ ایسے سہانے لگتے تھے جیسے کوئی بھونرا چڑیا چہچہا رہی ہو۔ قدرت کو نسائی کے یہ طور اچھے لگے وہ تو خوش آمدید کہنے کی بجائے گویا اس کے پیشہ کی اور خود اس کی دھول اڑا رہی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی اس کے بے ساختہ پن پہ ہنس پڑا اور اپنے مدہم رنگ چہرے میں سفید سفید دانتوں کی لڑیاں نظارہ کے لئے پیش کر دیں۔

نسائی نے قدرت کے لئے کرسی نما پیڑھا لا کر بچھایا تو اس کی طبیعت کچھ ہلکی سی ہوئی کہ اس دختر کی میزبان نے اس کا آدر کیا ہے۔

قدرت، نسائی، محمول، اشرق مودیہ سہ دری کے اندر بیٹھے ہوئے تھے جس میں تیرس کی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ ماں جنگلے دار کھڑکیوں والے پچھلے کوٹھے میں پڑی ہوئی دردِ سر سے کراہ رہی تھی اسے تپ لرزہ بھی ہو رہا تھا۔ پھر محمول ماں کے لئے دردِ سر کی گولیاں لینے کے لئے سنگت عطار کی دوکان پہ چلا گیا اور نسائی اندر جا کر ماں کی کنپٹیاں دبانے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس نے سوچا وہ تو سہ دری ماں کیلا اکیلا بیٹھا ہے میں تو اسے پھر کھجا کر آؤں گی یہ خیال عملی جامہ پہننے میں اتنا سخت بے تاب ہوا جیسے بسمل گھنٹہ پانے کے لئے پانی مانگے۔ وہ اس طرح سے اٹھ کر برآمدہ میں گئی جیسے جہانگیر نے انصاف کا گھنٹہ سن لیا ہو۔

تیرس کے چاند نے پورا کھیت کیا ہوا تھا سہ دری میں دودھ سی چاندنی کھیل رہی تھی۔ انگنائی میں کھڑی ہوئی جامن پہ دو رت چڑیاں باری باری سے بول رہی تھیں۔ نسائی نے اپنے ہونٹ پچکارنے کی طرز میں آگے

بڑھائے اور قدرت کے منہ کے سامنے منہ کرکے کہا "پیں ہیں پیں وہ کرسی نما پیڑھی سے اٹھا اور نسائی کو سزا دینے کی خاطر دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اپنی گودی میں بٹھالی ۔ قدرت اس کے ہونٹ جوش جنون کے ولولہ اور سختی کے ساتھ چومے چومے جا رہا تھا. نسا کسمسا رہی تھی پھر قدرت نے اسے زمین پر کھڑے کرکے کہا . پیں پیں، ہیں یعنی وہ نسائی سے بدلہ لے چکا تھا ۔ اور نسا منہ کو بھاؤ بتا کر گا رہی تھی

بانکے رے بانکے ۔ مجھے تیری بہلنا

جب دن ڈھلے مسند پور کی بارات رخصت ہو کر چلی اور انگریزی باجے والا بادل والی حویلی کے سامنے پہنچا تو بنیوں کی ساڑھی گھنگرے پہننے والی لڑکیاں حویلی کے کوٹھے سے قدرت کو دیکھ رہی تھی ۔ نسائی کی ماں کو آج بھی تپ لرزہ چڑھا ہوا تھا لیکن اس کی بجائی اسے بکچی بھکتی کو چھوڑ کر گلیارہ میں تماشہ دیکھنے آگئی تھی قدرت اسے کرتا سیٹھ کی حویلی کی بیل بوٹے دار چھوٹی سی بہلی نما محراب میں مندر کی مورتی کیطرح کھڑی ہوئی دیکھ رہا تھا ایسی محرابیں ڈیوڑھی کے پھاٹک میں دونوں طرف تھیں ۔ نسا تو صرف تماشہ دیکھنے آئی تھی لیکن قدرت یہی سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے ہونٹ پچکارنے کی طرز میں آگے کو بڑھائے اسے چڑانے کو پیں ہا پیں کر رہی ہے۔

۲

نسا کچھ دن بعد ہی قدرت کو بھول گئی، باراتوں میں جو باجے

آتے اس نے انہیں سن کر بھی کبھی اسے یاد نہ کیا۔ یوں ہی تین سال گذر گئے۔ پھر اس کا چہرہ سرخی پاؤڈر لگائے بغیر ہی لال لال ہو گیا۔ سینہ کی دونوں نوکیلی رفعتیں انگیا کی کٹوریاں اور قمیص پھاڑ کر سرے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگیں اور نچلی نچلی آنکھوں سے رنگ فتنہ گری ٹپکنے لگا... تو اس کے ابلتے ہوئے جوبن کی سب سے زیادہ سینک سوتیلے بھائی مخمول کو پہنچی۔ ان دونوں کی ماں ایک تھی باپ دو۔ مرحوم نمبردار نساء کی ماں کو ...ری کے میلہ سے اغوا کر کے لایا تھا۔ وہ خانہ بدوشوں میں سے تھی۔ جنہیں انگریزی میں جپسی کہتے ہیں۔ یہ مردار خور قوم گیدڑ لومڑی تک کا شوربہ کھاتی تھی۔ اور ان میں سگے بھائی بہن تک جنسی طور پر آپس میں آلودہ ہو جاتے تھے۔ سگے بھائی بہن میں شادی بھی ہوتی تھی۔

مغویہ نے نمبردار کے ساتھ آتے ہی کندن والے میں اسلام قبول کر لیا اور نمبردار کے مرنے کے بعد جب مخمول اپنی ماں کے پاس پہنچا تو اسے بھی گاؤں کی واحد مسجد کے ملاں نے کلمے پڑھا دیئے۔ یہ نوجوان خانہ بدوشوں سے تو قطعی کٹ گیا تھا۔ اور نمبردار کی ذات برادری بھی اسے ناطہ دینے کو رضامند نہ تھی۔ اب اس کی نگاہ تھی تو صرف نساء پر۔ خانہ بدوشوں کے رواج کے مطابق تو یہ رشتہ مباح تھا ہی لیکن گاؤں کے ملا نے فقہ کی کتاب دیکھ کر فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ دو مختلف باپوں اور ایک ماں کے بہن بھائی بیاہے جا سکتے ہیں۔ مخمول اور نساء کی ماں ایک تھی باپ دو نساء کا باپ نمبردار تھا۔ مخمول کا خانہ بدوش۔

نمبردار نے اپنی زندگی میں کبھی مخمول یا اپنی بیوی کے دوسرے رشتہ داروں کو نسا کی ماں سے نہیں ملنے دیا۔ اس نے اپنی لڑکی کے دل میں ان کی طرف سے حقارت بلکہ گھناؤنا پن ڈال دیا تھا۔ اس لئے گو مخمول نے نہا دھو کر کلمہ پڑھ لیا تھا۔ نسا پھر بھی اس سے اس طرح کتراتی تھی، جیسے اچھوت سے برہمن۔ اس نے ان برتنوں کا استعمال ترک کر دیا تھا جو مخمول کے استعمال میں آتے تھے۔ جب انہیں ساتھ رہتے کئی برس گذر گئے تو چھوت چھات تو تقریباً اٹھ گئی مگر حقارت اور گھناؤنے پن کے جذبات فرو ہوتے ہوتے بھی پوری طرح سے فرو نہ ہو سکے تھے مخمول اسے منہانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ ہنستی نہ تھی وہ اسے اس لئے بھائی کہہ کر پکارا کرتی تھی کہ بھائی ہونے کے سبب ان میں رشتہ ازدواج قائم نہ ہو سکے اس نے ملا کا فتویٰ تسلیم نہ کیا تھا۔ مخمول شاید چھپکے پینے کے لئے نسا پر دست درازی بھی کر بیٹھتا لیکن اسے زہر باد کی بیماری ہو گئی تھی اور وہ نحیف و زرد ہو گیا اس طرح سے نمبردار کی یتیم لڑکی محفوظ ہو گئی تھی۔

پھر انہیں دنوں جب مخمول کو نسا کے جوبن کی سینک پونہچنی شروع ہو گئی تھی چھم چھم چھما چھم ساون آیا اور ہریالی کچے کوٹھوں کی چھتوں منڈیروں چڑھ گئی۔ اتر دشا سے وہاں بادل امنڈ گھمنڈ کر آیا اور ایسا جھلکا جیسے پکھالوں پانی پڑنے کو تیار ہے، تریا تو منہاری کی انگنیا میں کھڑے ہوئے بمو اپر جھکے پڑے ہے۔ مہرولی (دہلی) کی لڑکیوں نے جن کے خاندان

ہندو مسلم فسادات میں اجڑ کر کندن والے آ گئے تھے۔ گیت گا رہی تھیں۔ گیت عہد شاہجہانی کی منگل برہن کا اپنے محبوب کی جدائی میں نوحہ تھا۔ یہ محبوب دکن میں مرہٹوں اور بیجاپور کے عادل شاہ کے خلاف برد آزما ہو گا۔ گیت کے کچھ بول تھے :-

شاہجہان سے کوئی کہہ دے۔ ناصر کو کیوں رَن پہ بھیجے
سبزے کا آغاز ہے جس کے " " " " " "

بیجاپور پہ ہل چل جائے — عادل شاہ کا گھونٹ جائے
شاہ ہو دلی پکڑا آئے — ناصر کو کیوں رَن پہ بھیجے

ساتھ میں جب تم لڑنے جاؤ — بانکے پن پن خوب دکھاؤ
یاد ہماری دل پہ لاؤ!!! — ناصر کو کیوں - - - -

کوٹھوں پہ جب بادل چھائے — پنچھی رسے میں چھپ اڑ آئے
رین اندھیری ہم کو کھائے — ناصر کو کیوں - - - -

یہ بول سن کر نسائی کے دل میں چوٹ سی ابھرنے لگی اسے قدرت ایسا یاد آیا جیسے اس کے دم پہ بن گئی ہو وہ سسکنے لگی جب کسی نے اسے یہاں آنے سے روک رکھا ہے۔ خدا اسے نشٹ کر دے سامنے

وہ سما یاد آنے لگے جب قدرت نے گودی میں بٹھا کر جوشِ جنوں
کے دلولے اور سختی کے ساتھ اسکے ہونٹ چومے چوسے تھے۔ اس طرح
سے اُسے کبھی نے نہ چوما تھا۔ نہ وہ اس طرح سے کسی کی گود میں بیٹھی
تھی۔ اُسے یہ بھی خیال آرہا تھا کہ ممنوں کو درد سر کے لئے منگت عطار
کی دوکان سے گولیاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ جو ماں کی کنپٹیوں کو اس
دن قدرت داب دیتا تو ساری عمر بھی ماں کے سر پر کبھی دھمک نہ
ہوتی، البتہ دابنے والے کے لئے الٰہی حلوائی کی دکان سے مٹھائی منگوانے
میں کچھ مضائقہ نہ تھا اور جو وہ مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں نفیری کی طرح
سے اٹھا کر بل بل کے بجاتا تو میں مگن ہو ہو جاتی۔ جب بارات رخصت
ہو رہی تھی۔ باجہ بجتا ہوا جا رہا تھا تو میں پہلی ایسی محراب میں مورتی کیطرح
سے کھڑی ہوئی ہوتی اس وقت تو سارے باجے بند ہو جاتے
اور صرف قدرت ہی اپنی نفیری بجاتا رہتا اور میں ہمیشہ اسے وہیں کھڑی
ہوئی دیکھتی رہتی۔

لگے دن صبح سے بوندا باندی ہوتی رہی تھی دن ڈھلے مینہ تھم گیا
تھا لیکن بادل ابھی تک جمے ہوئے تھے۔ وہ شرق رویہ سہ دری سے اٹھ کر
کوٹھے کی جنگلے دار کھڑکی سے گلیارہ دیکھنے لگی۔ قدرت رزاق کمبوہ سے
آم خرید رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار جنگلے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ
ذلیل معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ملازم مالک سے روٹھ کر چلا جائے اور اسے
نوکری نہ ملے تو وہ مالک کے دروازہ کے سامنے ادھر ادھر ٹہلے کہ شاید مالک

سے بلا لیگا ۔ نساء کے دل میں اسے دیکھتے ہی خوشیوں کے انار چھوٹنے
لگے ۔ اسے قدرت پر رحم آنے لگا کہ یہ کیسا بے آسرا بے آسرا پھر رہا ہے
وہ اسے آواز دینے کو تھی لیکن اس لڑکی کو اس کا نام یاد نہیں رہا تھا۔
پھر وہ پکارنے لگی " ارے باجے والے " یہ آواز سنتے ہی اس کی
ماں آگئی جس نے جنگلا بند کر دیا نساء کی آواز ایسی خفتاتی تھی جیسے اس
کا جی بھر آیا ہو ۔ ماں نے تڑپ بھرے ہو کے پوچھا ۔ سڑک چلتوں کو پکارن
لگی ۔ یہ کون تھا ؟

" بھائی کا آڑی ۔ " تیں اسے نی (نہیں) جانے ہے ۔ یہ جد آیا تھا
تیں تاپ میں پڑی تھی ۔"

" تو ہے کون ۔"

" باجے والا ۔ بیٹوں کی برات ماں باجہ بجاوے تھا ۔ جس ماں
ہاتھی آیا تھا ۔"

" پھر تیں اسے کیوں پکارا ؟ "

" بہت دنوں ماں جو آیا تھا ۔ "

جب یہ دونوں ماں بیٹی سہ دری میں آگئیں تو نساء کو پھر بھی قدرت ہی
کی دھن لگی رہی ۔ باجے والے کا نقشہ اس کے کلیجہ میں چٹکیاں لے
رہا تھا وہ اس کا پھر نظارہ کرنا چاہتی تھی اس کی ماں شمال میں بچھی ہوئی
چارپائی پہ چادر تان کر لیٹ گئی ۔ تو اس نے سوچا کہ وہ میرے ملنے
کے لئے نہیں تو میرے مترے سے ملنے کے لئے ضرور آئے گا جیسے

یہیں سہ دری میں بیٹھے ہوئے دروازہ کو تکتا رہنا چاہیے جس سے وہ آئیگا لیکن دل کی بے تابی اسے کہاں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ ننگے پاؤں پھر جنگلے پہ پہنچ گئی۔ قدرت پورب میں مندر کی طرف جا رہا تھا جس کے بھاری بھر کم مخروطی گنبد پر سونے کا جھول پھرے ہوئے پانچ کلس تھے اور بیچ والے ابھرواں کلس پر سونے کا جھول پھرا ہوا چھوٹا سا ننھا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ وہ اس مندر سے آگے نکل گیا۔ نسا ابھی جنگلے میں ہی بیٹھی تھی کہ ماں نے پھر اندر پہنچ کر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

جب سے لمبے گنبد مینار کی مسجد میں عشا کی آذان ہوئی تو قدرت صحن کے آخیر میں باہر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ ماں دروازہ کھول کر اسے سہ دری میں لے آئی۔ نسا نے لے کر سی نما پیڑھے پر بٹھایا وہ اسے اس طرح سے دیکھ رہی تھی جیسے رعایا اپنے بادشاہ کا درشن کرے۔ پھر نسا نے کہا، بھائی تو یہاں نی (نہیں) اکل آدے گا۔ مندلپور والے حکیم پہ گیا ہے۔" قدرت کہنا تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ نہیں ہے تو نہ سہی تو تو ہے لیکن اس نے جواب دیا۔"

"تیں مجھے نہ جانے ؟" نسا پٹ سے بولی۔ "باجے والا ! پیں پیں پیں"

قدرت نے اپنے مدھم مدھم چہرے میں سفید سفید دانتوں کی لڑیاں نظارے کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا: "اب تو سیانی ہو گئی، یانے پن کی ہٹ چھوڑ دے۔" ماں سمجھ گئی کہ یہ وہی دلچسپ لڑکا ہے جسے دیکھنے کیلئے اس کی بیٹی دو مرتبہ جنگلہ پر گئی تھی اور جس کی پہلی آواز اسے آج تک یاد ہے۔

ماں نے اسے حقہ پانی تک کو نہ پوچھا۔ لیکن اس نے باتوں کا جھڑ

باندھ رکھا تھا کہ مخمول کس طرح سے دوسری مرتبہ مسندپور میں اس کے پاس ٹھہرا
ہے۔ وہ ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ شاید اس سے اس کی کچھ آؤ بھگت ہو جائے
لیکن ماں تو ذرا بھی نہ پسیجی۔ پھر بوندیں اتر آئیں پہلے ہلکی ہلکی پھر زور زور سے
رات ایسی اندھیری تھی کہ باہر دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ یورپ کے قرون
اسود بھی ایسے سیاہ نہ ہوں گے۔ ایسا اندھیرا قبل ظہور پیمبر فاران کی چوٹیوں
پر بھی نہ ہوگا۔ مسندپور کے پہنچنے تک ایسی رات میں اندھے ہو گئے ہوں گے۔

ماں چاہ رہی تھی کہ وہ کسی طرح سے اٹھے اور جائے۔ کافی دیر بعد جب
بوندیں تھمیں تو ماں نے شام کے مہمان سے کہا "بھائی باجے والے مینہ ٹھہر
ہوا ہے نکل جا۔ کہیں پھر نہ برسن لاگے۔" وہ اب بھی ڈھیٹ بنا رہا۔ لیکن جب
ماں نے وہ فقرا دوبارہ دوہرایا تو اس نے جانے کی ٹھان لی۔ جاتے جاتے
وہ نساء کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا کہتا جا رہا تھا۔
"اُس نظروں آنکھوں پہ ٹھیکری نی رکھا کرتے۔ نیں مجھے کھواری (خواری) دینے
واسطے ہی تھی۔ جھوٹے منہ سے کہہ دیا ہوتا، اجی ٹھہر جاؤ۔ ایسی بریکھا ماں جاکے
کیا کروگے؛ بس دیکھ لیا تیرا گاں (گاؤں) ہیں تو تیری واہیں پہیں والی انوٹ
کھینچ لائی تھی۔" اور نساء گویا جواب دے رہی تھی "کیا بک بک لگا رہا
ہے تیں بی (بھی) تھوڑا سا نئیں۔ بھلا اُدن (اس دن) تیں میرے ہونٹ
اپنی لاتنی؛ سلکھتی سے کیوں ہوئے تھے۔ ہم نے بھی تجھے دیکھ لیا۔ پھر
ایسی اندھیری گھپ رات میں جد گھر پاکڑی مرد نئیں ہم تیرے جیسے
مسٹنڈے لوں کیوں ٹھہرتے۔ جو ایک دپھہ (دفعہ) ایتبار (اعتبار)

بکھو میٹھا......... کھو میٹھا۔"

قدرت دروازہ کھول کر نکلا ہی تھا کہ نسا کی ماں نے فوراً اس طرح سے کنڈی لگائی تھی کہ جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ پھر نہ اندر آ جائے۔ چھم چھم چھما چھم مینہ پڑنے لگا۔ وہ چاہتا تو رانگھڑوں کی چوپال میں ٹھہر جاتا جو گاؤں کے نکال پر تھی لیکن اس کا تو کلیجہ ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ اس کی طبیعت اس گاؤں میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہرنے کو نہیں چاہتی تھی اس لئے اسے بھیگتے ہوئے ہی مسندپور کی راہ نا پنی پڑی۔ اسی رات جب بجلی چمکتی۔ مینہ پڑتا۔ بیر جھے میں کھڑی ہوئی بیری سے تیز ہوا میں شاں شاں کی آواز نکلتی اور اس کے گھنے گویا تھنے سے جدا ہو کر اڑتے ہوئے سے معلوم ہوتے تو نسا محسوس کرتی کہ نہ صرف قدرت ہی مینہ میں بھیگ رہا تھا وہ بھی ساتھ بھیگ رہی ہے وہ صبح تک یہ معما حل کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ آخر وہ کمندن والے بن آیا کیوں تھا؟ کیا اس سے ملنے کے لئے؟ اس سے ملنے کو کیا ضرورت تھی؟

۴

جب ممولی مسندپور سے واپس آیا تو نسا نے قدرت کی درگت کی داستان اچھلتے ہوئے دل سے ایسے شکایتی سے انداز میں پیش کی کہ وہ خود شرمندہ سا ہونے لگا اور اس نے یہ دھبہ دھونے کی تیاری کر لی۔

اگلے دن وہ اپنے دوست کو لینے کے لئے چلا گیا۔ اور نسا گھر رہ کر اس خوشی کا ایسا انتظار لگ گیا جیسے مسلمان کو عید میں ہوتی ہے اور عیسائی کو بڑے دن میں۔ مہمان کے لئے لڑے کا طباق بننا تھا۔ اس کے لئے منگت عطار کی دکان سے چاندی کے ورق اور کشمکش بادام خود نسا لے کر آئی تھی۔ اس کے دل میں آرہا تھا کہ مخمول کے ساتھ وہ بھی قدرت کو لینے کے لئے مندپور چلی جاتی، کیونکہ اسی طرح سے اسے ہم کشش انتظار تو نہ ہونا پڑتا اسے ایک کھٹکا بھی تھا! وہ یہاں سے بھگا کر نکالا گیا کیا خبر وہ منٹ دکھاں لگے۔ نہ کرے۔ وہ اس سے معافی چاہنے کے لئے جان بھی ترک دینے کو تھی اس نے یہ بھی پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ جو وہ پر یا آگیا تو ماں بھائی کے سامنے تو نہیں لیکن موقع پایا تو اولے پیچھے وہ اسے چاؤ پیار سے پاٹ بھی دے گی۔ جب عشا کی نمازیں ہو چکیں تو منگت عطار کے لڑکے نے آکر خبر دی کہ مخمول مندپور سے کل آسکے گا۔ اس خبر سے اس کی خوشیاں اس طرح سے مبدل بہ غمی ہو گئیں جیسے بجلی کا سوئچ دبا دیں تو یک لخت اندھیرا ہو جائے۔

قدرت اور مخمول اگلے دن گندن والے پہنچے مہمان کے لئے ابر حلوائی کی دکان سے تازہ تازہ گھسیہ منگایا گیا۔ قدرت کی چا۔ پائی مخمول کے ساتھ آنگن میں بچھی۔ ماں بیٹی سو رہی ہیں سو رہی تھیں اصل میں ملی سو رہی تھی نسا جاگ رہی تھی۔ وہ اس لئے جاگ رہی تھی کہ قدرت بھی جاگ رہا تھا کیونکہ جب رات کی گھڑیوں بیچ ٹوٹی تو وہ نسا کی پٹی کے نیچے

کہہ رہا تھا، "لالی لالی! مجھے پکڑوا دے، کھوب تور جور سے چلپلیاں مار کے کہہ دو ڑبو وڑ یو یو قدرت کیا چاہتے ہے، جو تیں کچھ نہ بولی تو میں سمجھوں گا تیں میری میت بن گئی۔" نسا کچھ نہ بولی بلکہ اس نے تو دوسری طرف کروٹ بدل کے جتا دیا کہ وہ جاگ ہی نہیں رہی بلکہ اس نے تو قدرت کی باتیں بھی نہیں سنی ہیں۔ اب وہ تیسری ہی تو سو گیا۔ جس طرف نسا نے کروٹ لی تھی۔ اس طرف ماں کا پلنگ تھا اور دونوں پلنگوں میں اتنی کم جھید تھی کہ وہ وہاں نہیں آ سکتا تھا۔ اب اس نے سر اپنے کھوٹے ہوکر اپنے ہونٹ نسا کے ہونٹوں کے ساتھ اسی کئی سال والی سختی کے ساتھ حق دار کی طرح ملا دیئے۔ نسا نے اُسے پرے ہٹانے کی حاجت نہ سمجھی۔ وہ تو ایسی بن گئی تھی جیسے کوئی ماہر ساز ندے ہر دو ساز چاہیے...... کہ اسے بجائے۔ بجاتا ہی رہے اور انگلی تار پہ پہنچنے سے پہلے ہی تار خود بخود اسی کی طرف اٹھنے لگے۔ نسا چاہ رہی تھی قدرت اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے کبھی نہ اٹھائے بلکہ وہ اس کے اوپر آن بیٹھے۔ وہ اگر بھاری بھرکم بھی ہوگا تو اسے خوشی سے برداشت کر کے پارہ پی ہوئی سی پڑی رہے گی۔ پہلے قدرت ہی اسے چاؤ پیار سے پاٹ دے وہ بعد میں پاٹتی رہے گی۔ پہلی اس کی بھی سہی اس وقت قدرت اپنی زبان سے نسا کے ہونٹوں کی ملنگ سی کر رہا تھا۔ اور نسا سہمی گنی سی بن گئی تھی۔

کچھ دیر بعد یہ دونوں ڈنڈے دار سیڑھیوں سے کوٹھے پر چڑھ رہے تھے۔ قدرت آگے آگے تھا۔ جب وہ لب بام تک پہنچ گیا تو اس

نے دیکھا کر نسام تو حسینوں کی مشہور جبلّی اور ترسانے والی عادت کا اعادہ کرتے ہوئے ابھی نیچے ہی کھڑی ہے اس نے جلدی جلدی نیچے اتر کر کہا "جرنیت نہ ہونہ آ" نسائی نے اپنا سر اٹھا انکار سے ہلا دیا۔ قدرت نے دھمکی دی "مان جا! نہیں تو مسک بنائے کے بھی تو ہٹائے جاؤں گا۔" اوپر جاکر نسائی نے پوچھا "ارے باجیہ تو ڈوم دھاڑی بجایا کریں ہیں تیں یہ بیبہ کیوں لیا؟"

"میں اپنے گاں (گاؤں) ماں سروغ (شروع) سے بین بجایا کرتا تھا۔"

"کیسی بین بجایا کرے تھا؟"

"ایسی بجاؤں تھا، ایسی بجاؤں تھا اک دکہ میری بین سن کے دیوال کے دیئے جاٹ کے بلوں ماں سوئے سانپ سنپولے باہر نکل آویں تھے۔"

"جھوٹ جھوٹ، ہاں جو لیں کو بتا میری بین سن کے گاؤں گوٹ کی چھوکریاں دہی بلونا، اٹیرن، چرخے ہور اوکھلی موسل چھوڑ کے ننگے پاں دلیوں سے باہر نکل آویں تھیں تو کوئی بات بھی بنتی۔"

"اچھا ہور سن میں کسان کا بیٹا ہوں۔ تمہارے دونوں کنڑوں پہ دو دو مال والی ڈومیوں کے ہر ملے ہیں۔ مرتی گھرکی ہے۔ میری ماں سے لڑ کے مسند پور آگیا تھا۔ نوکری ڈھوتا تو سر کے بال تک اڑ جاتے اب باجا بجاتا پھروں ہوں۔ تیں تو ہماری آج جیا بھت

ضیافت) کی تو گھی بورا کھلا دیا - ہم جس برات ماں سجاں ہیں تحفہ کھانا ملے بے ساتھ تیرے جیسی چھوکریوں کا دیدار بھی ہو ہے ۔"

"ارے نکھد بد ماس تیں چھوکریوں کی دیدار باجے کی کھاطر (خاطر) ہی باجے والہ بنا ہوگا کبھوں رے پنچال؟"

"باجے والا نہ بنتا تو تیرے جیسی ناس پیٹی کس طروں ملتی؟"

جنہیں ملنا ہو وہ سات سمندر پار آ کر ملتے ہیں برسات کی جھڑیوں میں آدھی رات بھوت جیسے دیسی آموں کے تلے ملتے ہیں

اس وقت بادل پھٹا ہوا تھا تو آسمان میں غلیلیں دکھائی ہو رہی تھی ان میں تارے ٹمٹا رہے تھے۔ ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے ساحلی ریگستانوں میں وقت سحر چلے۔ اور مستعد سنتریوں تک کو سلا کر رکھ دے۔ نہ جانے نسا کو ... کیا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں قدرت سے کاریوں کے مزے لے لے کر کچھ تھوڑی دیر کو پھر اسی لگی تھیں اس نے قدرت کی لمبی گردن میں ٹھوڑی کے نیچے کاٹ لیا تھا۔ قدرت کہہ رہا تھا "میں نہیں جانوں تھا تیں اتنی نیوری ہو جاگی۔" اور نسا گویا جواب دے رہی تھی۔ "میں تو سوچا تھا تجھے اوپلے پاچھے چاؤ پیار سے پاڑوں گی۔ تیں نے تو میرے ہوس (ہوش) ہی گدلا دیئے۔" جب نسا کوٹھے سے اتری تو وہ نہ تھی جاوہ پر گئی تھی اور جب اگلی صبح پر پایا جانے لگا تو اس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ دھندلی دھندلی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

ادھر قدرت گھر سے نکلا ادھر لنسا کے دل میں درد جدائی کی ٹیسیں شروع ہوگئیں، ماں کے درد سر کا علاج تو سنگت عطار کے پاس تھا۔ لیکن لنسا کے درد فرقت کی دوا صرف اس کے پاس تھی۔ جس نے یہ درد دیا تھا۔ سوائے ممول کے قدرت کو کوئی بلا بھی نہ سکتا تھا اور وہ اسے بلانے کے لئے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ دن گذرتے جا رہے تھے اور ہر دن اس کے لئے شدید عذاب لے کر آ رہا تھا اور وہ خیالوں میں ساری رات ہی قدرت کے ساتھ غوطم غوطہ ہوتی رہی تھی۔ اور جب ساڑھی پر درانتی پڑی۔ سوائے بنیوں کے گھروں کے گاؤں کا گل نکل دیکھ کھیتوں میں نکل پڑا اور گودڑ سے کے گیہوں، چنے کٹنے لگے تو لنسا ہر سال کی طرح نے سلا پہننے نہ نکلی۔ وہ سلا پہننے صرف خوش طبعی کے طور پر جاتی تھی۔ اس سال ان کے یہاں فصل کا بڑا زور تھا۔ رات کے وقت لنسا کی ماں ممول سے کہہ رہی تھی "نیں گاں دھورے کٹوا رہا ہے۔ سرمک کے پار ترائی کے جنگل دھورے اجاڑتا پھر رہا ہے۔"

ممول جواب دے رہا تھا "میں سمجھوں تھا گاں دھورے والے کھیتوں میں جیا سی اجاڑا ہو گا پہلے انوں کٹوا لوں۔ ترائی کے جنگل دھورے پھر چلے جاویں گے۔"

ماں پھر کہہ رہی تھی فصل جو رہوا کرے تھی تیرا باپ دونوں جگہ ایک ساتھ کٹائی لگایا کرے تھا۔ اس کے پاس گھوڑی تھی دم بھر یے ماں یہاں ہوتا تو دم بھر ماں وہاں۔ تیں بے مار (بیمار) بھی ہے ہوتا سواری کرنا جانے۔"

یہ گفتگو سنتے ہی نسا کے منہ سے دل کے یہ بول نکلتے نکلتے رہ گئے
" بھائی نہیں آپ گاں دھورے کٹوا تارہ ہور ترائی کے جنگل دھورے
والے کھیتوں کی رکھوالی کے واسطے مسند پور سے میرے پیا نو
بلوا لے ۔ اسے تو تیں جلد ہی بلوا لیا ہوتا جد گیہوں کے ہرے کھرے
کھیتوں کی بالاں سوکھا لانے والی ہواں سر جوڑ جوڑ کے ہلا کریں تھی ۔ ہور
سرس کی سوکھی تتار پھلیوں سے درد کے باجے بجا کریں تھے ۔ تیں نی
جانتا سڑک پار ترائی کے جنگل دھورے والے کھیتوں ماں اسی بکھت
(وقت) سے اجاڑا ہو رہا ہوگا ۔" لیکن یہ لفظ سراں جھپیڑ کی اپنے بھائی
کو ایسی صلاح کیسے دے سکتی تھی ؟"

پھر ان لفظوں کا مطلب نسا کی ماں اپنے منہ پر لے آئی " بھلا
جو تیں قدرت نوں بلا لے ۔" مخمل نے جواب دیا " باجے والا کھیتی کے
دھندوں نوں کیا جانے "۔ اب بھی نسا کے منہ پر یہ بول آتے آتے
رہ گئے کہ " بھائی نہیں قدرت کو محض باجے والا ہی نہ سمجھ ۔ وہ تو کسان
کا بیٹا ہے ان کے دونوں کنول پر مٹی کی ڈوبچیوں والی ڈبل مالیں
پڑی ہوئی ہیں ۔"

اب نسا کو یہ افسوس ہونے لگا کہ بھلا قدرت بھائی کو اپنی
داستان سنا دیتا تو کیسی اچھی بات تھی جو وہ اب آ جائے تو میں اسے کہوں
نے قدرت جو بھائی جان گیا تیں کھیتی کے دھندے بی (بھی) جانے
ہے تو گاج مارے تیری گیمت (قیمت) بڑھ جائے گی تجھے کندن سالے

ہیں ٹھہرنے کے بہانے مل جاویں گے۔

۴

قدرت کا دل بھی نساء کے لیے اکھڑا اکھڑا ٹوٹا ٹوٹا رہتا تھا۔ نساء نے اس کی لمبی گردن میں ٹھوڑی کے نیچے جو کاٹ لیا تھا تو قدرت کی مرضی تھی کہ وہ نیل جو نساء کے دانت سے ڈالے تھے۔ جنم بھر اچھے نہ ہوں۔ ہائے وہ اس رات کیسی نوری سی ہو رہی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا۔ دیہاتی ہیڈ ماسٹر کے گھر ڈیوڑھی کی جس بغلی کوٹھری میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے سامنے جمیعۃ قاسم پور بینے کی چوپال تھی۔ وہ چوپال میں گھبو لمبی لمبی چھتری پر کبوتروں کو اڑتے بیٹھتے دیکھتا رہتا۔ کبھی اس کی آشفتہ طبعی نفیری پر فرقت کے جاں گداز راگ گواتی اور کبھی وہ نہر کنارے کھونٹے سے مچھلیاں پکڑنے بیٹھ جاتا۔ جو کوئی مچھلی پھنس جاتی تو وہ اسے پھر سے نہر میں پھینک دیتا

ایک رات مخمورؔ اور اس کی ماں دور افتادہ کھیتوں کے اجاڑے پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ چوڑے چہرے والا خوش خوش چاند لمبے نرنگے سجیل سے اس طرح تک رہا تھا۔ جیسے اسے بھی اس گفتگو میں دلچسپی ہو۔ جیسے اسے بھی یہ تمنا تھی کہ ان دونوں کے فکر میں شریک ہو جانے تمباکو کے کھیت میں رکھوالے کی پیڑی پر سنجی ماتی کی خوش الحان اور چرچری

لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ ٹھمک بجا بجا کر گا رہی تھی ؂

جنہائی ماں آیو رے مورے میت
پڑیا بن کے آنا ہاں
رسیا بن کے آنا ہاں
سہاگن بن کے آنا ہاں
دِنا دِن، دِنا دِن، دِنا دِن، دِنا دِن
جنہائی ماں آیو رے مورے میت
کٹنی بن کے نہ آنا
کبڑھی بن کے نہ آنا
کٹھور بن کے نہ آنا
پیا بن کے آنا ہاں
رسیا بن کے آنا ہاں
سہاگن بن کے آنا ہاں
دِنا دِن، دِنا دِن، دِنا دِن، دِنا دِن
جنہائی ماں آیو رے مورے میت

تو اسی چاند کی سمت سے قدرت بھی آ گیا اس نے نساء کی طرف تو توجہ ہی نہ کی اور بھائی ماں کو سلام کر کے بولا! "تمہارے ترائی کے جنگل دھورے والے کھیت اجڑے جا رہے ہیں۔ کچھ بندوبست کرو، ہمارے دو جگہ کمائی لگا کرتے تھی۔ ایک جگہ میں

ہوا کرداں تھا - دوسری جگہ میرا امیّاں (یعنی باپ) -

یہ سنتے ہی نسا بڑھی خوش ہوئی اور خوش تو اس کی ماں اور متیرا بھائی بھی ہوا - اگلے دن دور آفتا دو کھیت قدرت کی نگرانی میں کٹ رہے تھے اور ان لڑکیوں میں جنہیں وہاں سیلا چننا نصیب ہوا انہوار سے چہرے والی نسا بھی تھی، سکھی نائی کی چرپراق لڑکی نے آج کہا "جو یہ مسندہ پور کا گلچہ (غلیظ) نہ آتا تو نمبردار کی ساڑھی ہی رہ گئی" دوسری نے پوچھا "کیوں - ری کیوں سکھی نائی کی پھیر کیا ہوتا؟"

سکھی نائی کی بولی "سارے گیہوں، چھنے بالوں پونٹوں ہوا سے چنگ چنگ کے تھرٹرتے ہور ساڈں ماں دانہ دانہ جھڑ جاتا نسا" ... سکھی نائی کی! تمہارے کھیت سے نکل جا - میں پا ہونے نوں گلچہ کیوں کہا؟ دکھے (یعنی دیکھ) تیرے باپ کی کسبت کھوسوا دوں گی -"

سکھی نائی کی - "نمبردار جی کی چھوکری! میں تیرے آگے ہاتھ جوڑوں میرے منہ سے گلچہ نکل گیا - مائیو (معاف) کردو جو تمہاری سادی ہوئی تو اس میں بیا بلا بھی تو میں ہی گاؤں گی -"

اس ہلکے سے جھڑکے کی شہرت سارے گاؤں میں پھیل گئی - کہ ان دونوں میں کچھ اندر رہا نہ ہے - حالانکہ نسا نے قدرت کو سوائے یونہی خفی سی چتونوں کے اس دفعہ اچھی طرح سے دیکھا تک نہ تھا - گر اصل میں وہ اس کے دم قدم کے ساتھ لگی پھرتی تھی - اس کا منہ

اس لیے چڑھ رہا تھا کہ جب قدرت چڑھ کے چاند کی روشنی میں آیا تو اس نے بھائی اور ماں کو تو سلام دعا کی لیکن اس کا حال احوال ذرا بھی نہ پوچھا۔ نسائی کو یہ خبر تھی کہ رواج کے موافق غیر مرد ھی دھانیوں سے زیادہ بات نہیں کیا کرتے اور نہ ہی سلام دعا۔ وہ قدرت کو ایک میٹھا سا چوکر دے کر دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا کیا حال ہوتا ہے لیکن خود چپ کے کھار ہی تھی۔ قدرت جب اس کے پاس سے گزرتا یا وہ کسی سے بات کرتی تو وہ ذرا بھی تو مائل نہ ہوتا۔

جب ساڑھی کٹ چکی اور اناج بھی اٹھ چکا تو قدرت کی کندن والا سے جانے کی باری آگئی۔ اس ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں چکوا چکوی آپس میں ایک بات بھی نہ کر سکے۔ جس رات کی صبح کو قدرت رخصت ہونے والا تھا۔ چاندنی ایسی کھل رہی تھی کہ سوئی میں دھاگہ پڑ سکتے تھے۔ نسائی کی چارپائی تو سرہانے آگے اس کی ماں کے پاس تھی۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور قدرت بھائی کے پاس بیری کے نزدیک سو رہا تھا۔ ان دونوں کی یہ رات بھی اکارت ہی گئی۔

۵

اگلے دن جب تھوڑا سا سورج چڑھے اس کا پریا جانے لگا تو نسائیوں محسوس کرنے لگی جیسے سارا کندن والہ ہی اس کے ساتھ جا

رہا ہے ۔ آسمان زمین اس کے ساتھ ہار رہے ہیں ۔ اور وہ اکیلی لڑ رہی ہے ۔ ماں نے مہمان کے لئے گاؤں کے گھی کے پراٹھے پکائے تھے ۔ اور ایک حلوائی کی دکان سے کھویا منگوا کر کھانچی کی کھانڈ کا دودھ سے صاف کر کے بنایا ہوا دانہ دار بورا اس میں ملایا تھا کہ وہ اس سے پراٹھے کھا سکے جب وہ چلنے لگا ۔ تو ماں دعائیں دیتی ہوئی دروازہ تک اس کے ساتھ آئی اور بھائی اسے گاؤں کے نکال سے گنا گھروں کی چوپال تک چھوڑنے گیا ۔ نسا اسے جاتے ہوئے کو دیکھ کر جنگلے والے کوٹھے میں جا لیٹی ۔ اس نے قدرت کو جنگلے میں سے جاتا ہوا دیکھ کر اپنا سینہ پیٹ لیا ۔

کنڈں والے سے مندرپور کا راستہ گم الائچیوں کے کنجوں کے پاس سے جاتا تھا ۔ یہ درخت یوکلپٹس ایسے تھے ۔ جن کے پتوں سے الائچی ایسی خوشبو آتی تھی ۔ یہ پیڑ بہائے اونچا جانے کے چھتری کی طرح سے چار طرف پھیل کر کنج بناتے تھے ان کے مغرب میں ایک بڑا نہر کا کنگرا تھا جہاں نسا کے ہم شکل اور ہم رنگ شمشاد کھڑے تھے اور جہاں شیام نہر بہہ رہی تھی ۔ نہر کا شرقاً غرباً پل لال پتھر کا تھا جس سے پانی میں اترنے کے لئے ہر ایک ندی سے زینے اترتے تھے ۔ تار کول بھرے ہوئے دروں کے اٹھانے کے لئے اوپر دستی مشینیں رکھی تھیں ایک اور آہنی پل اس برساتی ندی پر تھا ۔ جو نہر کو کاٹتی ہوئی غرب میں جاتی تھی شیام نہر کا پانی خشک برساتی ندی کے اونچے اونچے کناروں میں شمال کی جانب دو فرلانگ تک چڑھا ہوا تھا ۔ مندرپور جانے

کے لئے کنجوں تک اس طرح سے پہنچتے تھے کہ یا تو دو فرلانگ اوپر جاکر جہاں شیام نہر کا چڑھا ہوا پانی ختم ہو جاتا تھا۔ وہاں سے سوکھے سوکھے آتے یا چکر سے بچنے کو کنجوں کے سامنے والے کھلے کنارے سے ہی تاگھڑی تاگہری پانی میں کو گزر کر آجاتے۔

نسا آج برساتی ندی کے خشک راستہ سے آکر کنجوں میں چھپ گئی تاکہ اسے جاتے کو دیکھے جو اس کے بھائی کا بڑا فائدہ کہہ کے جا رہا تھا۔ لیکن اسے اجاڑ کر۔ وہ صرف قدرت کے سامنے آکر کھڑی ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال اس سے بات کرنے کا نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے یوں سامنے آنے ہی سے سب عقدے حل ہو جاتے تھے۔ وہ اس بات سے بہت ہی بیاکل اور شرمندہ تھی کہ اس نے اتنے عرصہ تک کیوں اس سے کلام نہیں کیا تھا۔

نسا گھر سے کسی کو کچھ کہہ کر نہ نکلی تھی۔ ماں نے اسے جنگلے سے قدرت کو دوبارہ پکارتے ہوئے دیکھ کر جھاڑا تھا۔ قدرت کی طرف داری میں وہ سکھی نانی سے جھگڑا کر چکی تھی اور پھر ان دونوں کا ایک دوسرے سے بلاوجہ کھنچے کھنچے رہنا بھی تو معنی معلوم ہوتا تھا اب وہ بلا اطلاع غیر حاضر تھی۔ اس لئے ماں کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو وہ قدرت کے ساتھ نکل گئی ورنہ ادھر کہاں جاتی۔

نسا کی ماں خانہ بدوشوں میں کی تھی جنہیں لیہ رپ ، میں جپسی کہتے ہیں۔ وہ کافی عرصہ سے مدنی زندگی گزار رہی تھی لیکن آج اس میں

پھر پرانا خانہ بدوشوں کا جھمیلا پن آ گیا ۔ وہ رانگھڑوں کی چوپال میں ممول کے پاس جا کر اس طرح سے غوغا کرنے لگی جیسے اپاگو نے اس وقت کیا تھا ۔ جب ڈیسڈیمونیا اور ھتیلو کے ساتھ چلی گئی تھی ۔ پھر زہر بادی ممول اور اس کی ماں شام نہر کی طرف دوڑے ۔

ادھر نساء کنجل میں چھپی ہوئی دور سے دیکھ رہی تھی کہ قدرت نے برساتی ندی کے سنسان پکے اور ڈھلوان کنارے پہ دھوتی اتار دی ہے اور وہ پانی میں داخل ہو رہا ہے ۔

اس وقت وہ بے تحاشہ بے باکانہ اور بے تابانہ بھاگ کر قدرت سے مل جانا چاہتی تھی ۔ کیونکہ اسے اس وقت وہی پر یا یاد آ رہا تھا جس کی لمبی گردن کی ٹھوڑی کے نیچے اس نے کوٹھے پر بنوری ہو کر کاٹا تھا ۔ اور اس کی آنکھیں کچھ دیر کو پتھرا سی گئیں تھیں ۔ جس وقت قدرت کے پانی تاگڑی تک پہنچا تو اس نے قمیص کو بھیگنے سے بچانے کے لئے کافی اوپر اٹھا لیا ۔ اس وقت نساء کی تلوار اور بھوگ اگنی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ قدرت سے ملاپ کی خاطر پانی میں آ جاتی تو پانی جلنے لگتا ۔

قدرت اس پار آ کر برساتی ندی کے پختہ اور ڈھلوان کنارے سے اوپر چڑھ گیا ۔ یہاں وہ لال پتھر کی چھتری سی تھی ۔ جس پر بعض دفعہ کئی کئی آدمی نماز پڑھ لیا کرتے تھے ۔ اور یہ پتھر کھڑے کلہاڑیاں چلانے کے کام بھی آتا تھا ۔ قدرت نے اپنی پوٹلی پتھر پر رکھ دی اور وہ کنجل

کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے ٹانگیں لٹکائے ہوئے بیٹھ گیا۔ نسا اس
کی طرف چپ چاپ کرتی چلی آ رہی تھی۔ قدرت اس کی جانب بڑھا تو وہ محبوبوں
کی دیرینہ حکمت بازی دکھاتے ہوئے پچھلے پیروں کنجوں میں بھاگ گئی

جس وقت یہ دونوں کنجوں میں داخل ہوئے تو مخمول مع ماں کے
پرلے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اور انہوں نے یہ جوڑا بخوبی دیکھ لیا تھا۔
جب ماں بیٹے کنجوں پہ آئے تو قدرت نسا کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ اڑن
گھائیاں دیتی ہوئی اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ قدرت اپنے دوست
کو دیکھتے ہی درختوں میں بھاگ گیا اور وہاں سے اپنے گھر۔ نسا کو مخمول
اور اس کی ماں اس طرح سے گاؤں میں پکڑ لائے جیسے خانہ بدوشوں
نے شکار مارا ہو۔ اب نسا نہ سر بازی سے نہ شادی کرتی تھی اور نہ
دوسرا کوئی بھی اچھا گھرانا اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے وہ کنواری
ہی بیٹھی رہی۔

پھر ایک سال جب جاڑا بیر پیٹ رہا تھا، شفتالو اور ناشپاتی
کے پیڑوں پہ تو پتہ نہ تھا لیکن شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔
شام نہر کے کنارے سے بیل چھوڑ لا رہا تھا۔ اور سارا دن ہکانے والے
خشک تیز ہوا جھکوروں سے مارتی گرد اڑاتی دن دن بھر چل رہی تھی۔ لکھمان
والد کے سائیں نمبردار کی بیٹی کو قدرت بے حد یاد آ رہا تھا۔ سختی نانی
کی بھیجی لڑکی کی امانت آئی ہوئی تھی جس میں مسند پیر کا دہی (انگریزی)
باجہ تھا۔ مخمول نے اپنی ماں کو یہ خبر آ کر سنائی "قدرت کا ماسٹر کیے

تھا ۔ اس نے شادی کر لی، اس کے دو بچے ہیں ۔" یہ سن کر نسانٹے نے کنواری رہنے کا اور بھی تہیہ کر لیا ۔ اس کے منہ میں ہر وقت یہ بول رہتے تھے ۔

جنہائی ماں آیو رے مورے میت
بانکے رے بلنکے مجھے تیری چپا نا
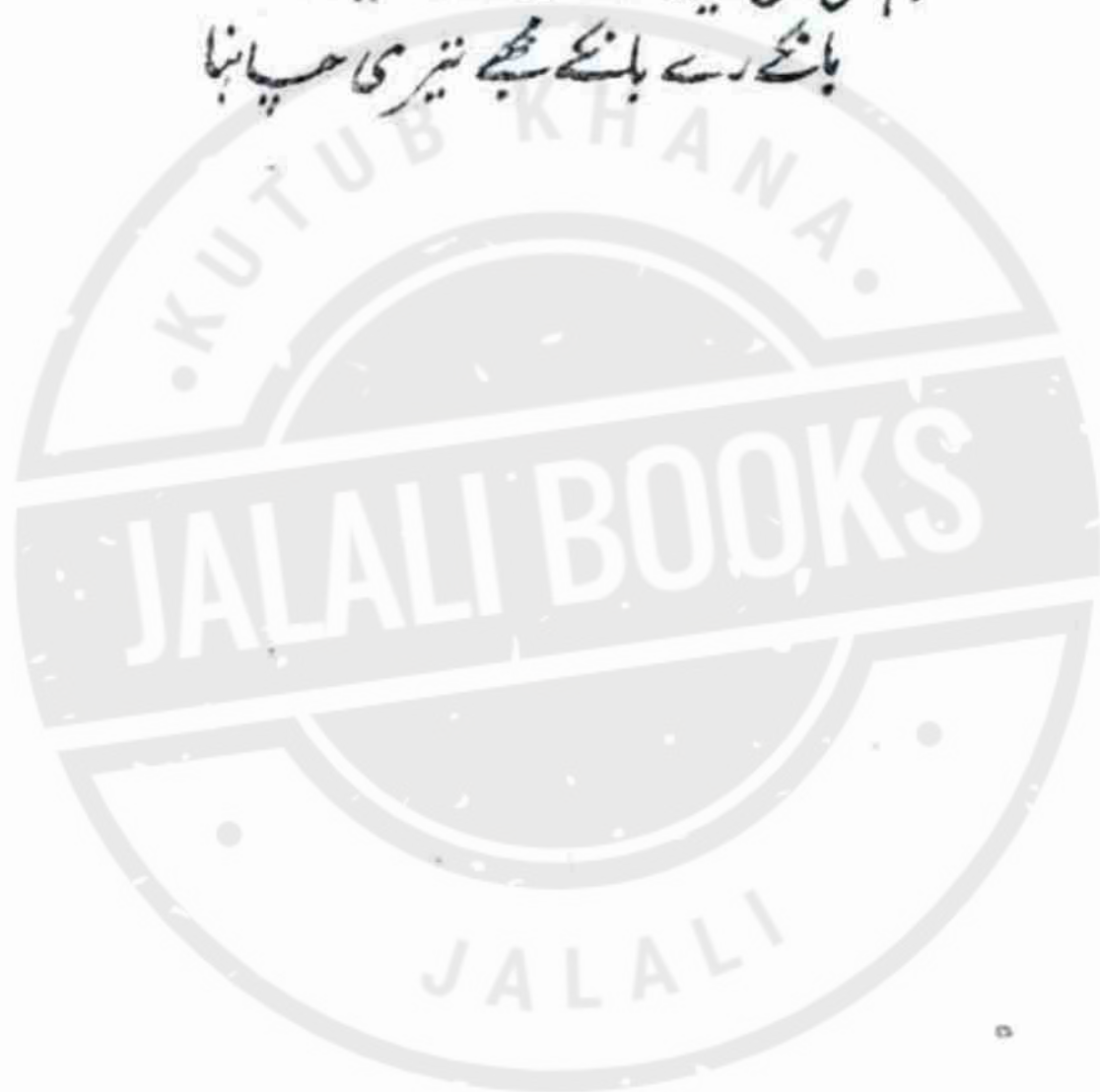
فتنہ بغداد

ماں باپ نے صرف جدت طرازی کی خاطر اس کا نام قبیحہ رکھ دیا تھا۔ ورنہ وہ حسن بے مثال تھی۔ اور ابتداء شباب ہی سے دارالخلافہ عباسیہ کے خاص و عام اسے فتنۂ بغداد پکارنے لگے تھے۔

کبھی اس نے ولیعہد سلطنت امین کی طرف ابو نصر جوہری کی دکان پر چور نگاہوں سے دیکھ لیا تھا۔ تو وہی نگاہیں ولی عہد کے دل میں کھب گئی تھیں۔ شہزادے کے اوسان جاتے رہے تھے۔

ملکہ زبیدہ خاتون اپنے لاڈلے بیٹے کی فرمائش پر قبیحہ کو ضرور پیغام بھیجتی، مگر ہارون الرشید مخالف ہو گیا۔ پرچہ نویسوں نے خبر دی تھی کہ وہ قبیحہ چاندنی راتوں میں کسی لبنانی امیرزادے کے ساتھ دجلہ کے غیر آباد اور سنسان مقاموں پر کشتی کی سیر کیا کرتی ہے۔

یہ رشتہ صرف اس بنا پر رک گیا، ورنہ اور اسے کون روک سکتا تھا۔؟

پھر اس کی شادی ایک لحت ملک عکاس سے طے ہو گئی۔ مگر ابھی رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ ملک عکاس کو سہارہ دیلم میں جلاوطن کر دیا گیا۔

اس نے ہارون الرشید کے باغی وزیر کو پناہ دی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو دار پہ چڑھا دیا جاتا۔

اس واقعے کے بعد ملک عکاس کے اقربا بغداد سے پچاس کوس دور جانب شمال اٹھ گئے۔ یہاں دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے ان کا محل تھا۔ جس کے چوگرد قسم قسم کی کھجوروں کے تختے تھے۔ ان باغات کو اتنی اونچی فصیل احاطہ کیے ہوئے تھی کہ اسپ سوار اپنے نیزے کو چاہے جتنا اونچا اٹھا کر پاس سے گزرتا اندر والوں کو اس کا سر النظر نہ آ سکتا تھا۔ فصیل کے ملحق جانب شرق بصرہ سے موصل جانے والی شاہراہ تھی جس پر ہر رات کاروان آتے جاتے رہتے۔

اس خود عائد کردہ دلیس نکالے کا مقصد دراصل بلا واسطہ طور پر ہارون الرشید پر اثر ڈالنا تھا کہ وہ ملک عکاس کو معاف کر کے واپس بلا لے۔

انہیں پہنچے ہوئے دو تین دن ہوئے تھے کہ ایک رات جب بالاخانہ پہ بالکنی کی بغلی محرابوں میں قوس قزحی پردوں کو نرم نرم باد صبا ہاں لہرا رہی تھی، اور انار نما قندیلیں صندلی چھت سے طلائی زنجیروں میں لٹکی ہل رہی تھیں۔ چاند نکلا ہوا تھا، کھجوروں کے باغات میں طلسمی سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی تو جرس کاروان کے ساتھ ساتھ ایسی آواز آئی، جیسے کوئی آہ و بکا کر رہا ہو۔ مگر کاروان گزر جانے کے بعد وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ایسا بار بار ہوتا رہا تو قبیحہ کے چچا نے اس کی پہچان بین کرائی۔ مگر کچھ کھوج نہ لگا۔

انہیں دنوں قبیحہ پر پہلا دورہ پڑا۔ وہ اسی بیماری میں مبتلا چلی آرہی تھی۔ اسے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دورے پڑتے تھے اور وہ بہت نحیف ہو گئی تھی۔

کبھی اس کا چہرہ جزیرہ صقلیہ کے سیبوں ایسا چمکتا ہوا تازہ تھا۔ مگر اب وہ فلسطین کا گریپ فروٹ بن کر رہ گئی تھی۔

کوئی کہتا کہ وہ آسیب زدہ ہے اور کوئی کچھ۔ اس کے علاج پر لاکھوں دینار خرچ ہو گئے۔ دمشق، بیروت، قیروان، قرطبہ و اشبیلیہ تک کے طبیبوں نے آکر اس کا علاج کیا۔ ہندوستان کے سیانے اور بار بلینہ کے کاہن تک بلائے گئے۔ مگر اس کی حالت بدستور چلی گئی۔ وہی زور زور سے رونا، چیخیں مارنا، کپڑے پھاڑنا، نہ کھانا نہ پینا، اور محل سے اٹھ اٹھ کر فصیل باغات کی طرف اموجہ سے دوڑنا کہ پھاٹک سے نکل کر ریگستانوں میں چلی جائے اور حبشی پہرے دار دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔

کم قیام موسم سرما کے بعد دیر قیام موسم گرما آیا۔ اور اسے شدید قسم کا دورہ پڑا۔ اس نے تمام پہلے دورے مات کر دیئے۔ جب دو ہفتے کے قریب گذر گئے اور راتوں کی نیند اڑ گئی تو اس کی ماں کو بڑا فکر ہوا قبیحہ اس کی اکلوتی اولاد تھی مگر اس کے باپ کے مرنے کے بعد اگرچہ اس نے عدت گذرتے ہی اپنے دیور سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ لیکن اس بارہ سال میں ان کے کوئی لڑکا یا لڑکی پیدا نہ ہوئی تھی۔ دور دراز ملکوں کے طبیب سیانے ۔۔۔۔ اور کاہن تو پہلے ہی آ چکے تھے مگر لاحاصل، اس نئے قبیحہ کی ماں کی

ہارائے ہوئی: "جب تک بغداد کے حکیم سے رجوع نہیں کیا جائیگا۔ کامیابی نہ ہو گی۔ دوسرے مقامات کے طبیب صرف طبیب ہیں۔ بغداد کے اطباء کو حکمت بھی آتی ہے۔ بعض امراض میں محض دوائیں کارگر نہیں ہوتیں۔"

"مگر جب تک ملک عکاس لوٹ کر نہ آئے گا، ہم بغداد سے کوئی سروکار نہ رکھینگے" قبیحہ کا چچا بولا۔

لیکن ہمیں تو اس کی جان بچانی ہے۔" قبیحہ کی ماں نے جواب دیا۔

ماں کی بات چلی، اور بغداد کے حکیم کو بلاوا بھیج دیا گیا۔

بغداد کے حکیم کو شہزادی کا مرض لا علاج معلوم ہوا۔

مگر ایک شب محل کے کتب خانے میں بیٹھے ہوئے اس نے واہمے کے طریقے پر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ سا تھر تھر آہ وبکا کی آواز سنی۔ وہ حبشی پہرے داروں سے فصیل باغات کا جنوبی پھاٹک کھلوا کر ریگستان میں نکل گیا۔

خدام اسے رات کے کھانے پر بلانے کو دوڑے۔ مگر وہ جا چکا تھا۔ اسے تلاش کرنے کے لئے قراول تک بھیجے گئے وہ انہیں تک نہ ملا۔

علی الصبح جب اونچے ٹھنٹھ پر بیٹھی ہوئی چیل بولی۔ ہدہد اڑتے پھرنے لگے۔ فاختائیں کھجوروں پر بیٹھی مکتب کے بچوں کیطرح ہل ہل کر نغمہ سرائی کرنے لگیں اور بغداد سے آئے ہوئے شکاریوں نے چھوٹی کمانوں کے ننھے ننھے تیروں سے دجلہ کے کنارے آبی پرند مارنے شروع کئے۔ تو وہ لوٹ آیا۔ وہ رات بھر نہ سویا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں جل نہیں رہی تھیں بلکہ اسکا چہرہ چاندنی کیطرح خنک تھا۔

اسے ایسی شتابی پڑی تھی۔ جیسے نامہ بر خلیفہ ثانی کو نہاوند کی فتح عظیم کا مژدہ سنانے جا رہا ہو۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے "یسّاعو یسّاعو (جلدی کرو، جلدی کرو) مرض تشخیص ہو گیا۔ اس کی جان بچ گئی۔ وہ نورِ نو ہو جائے گی۔ مجھے موقعہ دیا جائے۔"

اسے موقعہ دیا گیا۔ اس نے محل کا عجائب گھر کھلوایا۔ کبھی اس کی نگاہ بنو امیہ کے کسی خنجر پر جاتی تھی، کبھی کسریٰ کے نوادر پر۔ وہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر جوں ہی اس نے ایک خوش رو نوجوان کی تصویر دیکھی وہ ایسا ہشاش ہوا کہ جیسے کسی اعرابی کو اس کا کھویا ہوا اونٹ مل جائے۔

یہ تصویر الٹ پلٹ سامان میں پڑی ہوئی تھی اسے چھپانے کی غرض سے وہاں ڈالا گیا تھا۔ حکیم نے اس کی گرد دامنِ قبا سے صاف کی۔ وہ اسے لئے کھجوروں تلے پھرنے لگا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ آسمان پر نیزوں کی تیز نوکوں ایسے تارے پھوٹ آئے۔ عشا کے بعد دم دراز کھجوروں کے جھنڈ سے بے نور چپٹا چاند نکلا اور فصیل کے پہرہ داروں نے آج آہ و بکا کی جگہ قہقہوں کی آواز سنی۔ حکیم ان قہقہوں کو سن کر اس طرح کی حرکتیں کرنے لگا جیسے وہ مؤکلوں کو بلا رہا ہو۔ پھر کبھی وہ دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتا تھا اور کبھی جھولیاں دیتا۔

اگلے دن بعد عصر وہ تصویر کو محل میں لے گیا اور اسے بالاخانے پر قبیحہ کی خوابگاہ میں سجا دیا۔

جب سورج غروب ہو گیا اور چمگادڑیں اڑنے لگیں، تو قبیحہ کو تصویر

کے قریب لایا گیا ۔ اس کے پاس ایک پتلی سی مدھم موم بتی جل رہی تھی ۔ وہ آہستہ ہی اس کی طرف مائل ہو گئی، مگر حکیم تصویر پر سیاہ رومال ڈال کر اسے ہلکانے لگا ۔

اس وقت اس نے قبیحہ کے آگے پنج گوشہ پیڑھی دار طلائی طشتری میں گھلی ہوئی رس ٹپکتی کھجوریں پیش کیں ۔ یہ ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے کانچ شیرے میں پڑی ہوئی گلاب جامنیں ۔ شہزادی نے انہیں کھا لیا ۔ مگر کھکھل اب بھی جاری تھی ۔ حکیم اسے ترسا رہا تھا ۔ جب تاریکی بڑھ گئی تو رومال ہٹا دیا گیا ۔ پھر حکیم نے تصویر وہاں سے علیحدہ کر دی اور خود بھی چلا گیا ۔

اسی رات اس کی چیخیں بند ہو گئیں ۔ اس نے اپنے کپڑے بھی نہ پھاڑے وہ گہری فکر میں مستغرق تھی ۔

حکیم نے اپنا عمل کئی روز جاری رکھا ۔ اسے ہوش آنا شروع ہو گیا اور آخر میں تصویر اس کے حوالے کر دی گئی ۔

اب اس نے غسل کیا، پوشاک بدلی ۔ اس کی آنکھوں میں بابل کے جادو جاگنے لگے اور رخساروں میں صقلیہ کے سیبوں کا رنگ آنا شروع ہو گیا ۔ وہ روبصحت تھی اور حکیم اپنے دامن دیناروں سے بھر کر رخصت ہو گیا ۔

وہ کئی ماہ اچھی رہی ۔ یہاں تک کہ جاڑا گزر کر پھر گرمیاں آگئیں، اور اب پھر اسے دورے پڑنے لگے ۔ یہ دورے پہلے سے کہیں زیادہ سخت تھے ۔ حکیم کی تلاش ہوئی، مگر وہ بغداد سے غائب تھا ۔

اسے لبنان کے کسی نیم آزاد رئیس زادے کے علاج کے لئے

لے گئے تھے۔ جو دیودار کے جنگلات سے پٹے ہوئے پہاڑوں میں برف کی سفید سفید چوٹیاں ابھری چھوڑ کر پہلے تو خبر نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ مگر اب اس نے بعلبک کے کھنڈرات میں زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔

سنا گیا تھا کہ جنات کی داستانیں پڑھ پڑھ کر وہ پری کو فتہ ہو گیا ہے، اور خود اسی موہوم فضا اور ماحول کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہے۔ بعلبک کے کھنڈرات میں رہتے ہوئے اسے کئی ماہ ہو گئے تھے۔ حکیم یہیں آیا ہوا تھا عباسی قاصد نے اسے یہیں آلیا۔

جب حکیم قبیحہ کے چچا کے پاس پہنچا تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"تصویر دل سے اب یہ عقدہ حل نہ ہو گا میں نے تو وقت گذاری کے لئے تھوڑی سی افیون دی تھی کہ ملک عکاس کے آنے تک اثر باقی رہ جائے، مگر میں کیا کروں، مریضہ عادی بن چکی ہے، اور اب یہ نسخہ بے کار ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" قبیحہ کے چچا نے دریافت کیا۔

"مجھے وہ شخص لانا ہو گا جس کی یہ تصویر ہے"

"وہ ہمارا دشمن ہے۔" "عدوے مبین"

"کیوں؟"

وہ قبیحہ کا خواہاں تھا، گر وہ خاندان شاہی سے نہیں بلکہ محض ایک پہاڑی سردار ہے، اما ملک محمد دسمہ کی ایک چھوٹی سی ریاست کا امیر زادہ، ہم اسے

ناپسند کرتے ہیں۔"

"اے ...."

"ایسا ناممکن ہے، قطعی ناممکن۔"

"تو پھر مجھے اجازت ؟۔"

"کیسی اجازت ؟"

"یعنی رخصت کی۔"

"تم جا سکتے ہو۔"

قبیحہ کی حالت دن بدن ابتر ہوتی چلی گئی۔ اطبا چارہ سازی وحشت نہ کر سکے اور وہ تارہ جو شمع زندگی کے روشن رکھنے کے لئے ناگزیر ہوتا ہے، اتنا باریک پڑ گیا کہ تیز نگاہ والے اس میں اور موم میں تمیز نہ کر سکیں۔ اب تو شہزادی کی والدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے حکیم کے پاس ہرکارہ دوڑایا۔ حکیم نے بعلبک کے کھنڈرات کی راہ لی تھی وہ لبنانی رئیس زادے سے سرگوشیاں کرتا نظر آیا۔ جو حکیم کے ساتھ اس طرح پھر رہا تھا کہ جس طرح اروانہ کا بھوکا گھوڑا۔

کھجوریں پک گئیں۔ بغداد سے پچاس کوس باغ لب دجلہ کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں کہیں لعل بدخشاں سے زیادہ سرخ، کہیں پھلینوں سے زیادہ جامنی، کہیں فلسطین کے سنتروں سے زیادہ نارنجی اور کہیں قبیحہ کی تیلیوں ایسے سیاہ خرمے لہلہاتے درختوں سے ٹپک رہے تھے کہ ہارون الرشید کے پرچہ نویسوں نے خبر پہنچائی کہ شہزادی قبیحہ کا نجر کبھی فتنۂ بغداد کہلاتی تھی، بیمار حال ہے۔ خلیفہ نے برق پا شاہی گھوڑے ملک عکاس کے لانے کو اقلیم دیلم روانہ کر دیئے۔

مگر اسی دوران میں ایک شب پہاڑی رئیس زادہ قبیحہ کی والدہ کے

الیاسے بذریعہ چور دروازہ محل میں داخل ہوا۔ فہیمہ پہلے تو اسے دیکھتے ہی ہک دھک سی رہ گئی تھی۔ مگر بعد میں وہ دونوں لبنان کے برف پروردہ تفریحی میوے کھا رہے تھے۔

"پھر وہ بالا خانے پر عروسی دھجا کی خلوت گاہ میں پہنچ گئے جس کی حزب آئینہ بندی کی گئی تھی۔ یہاں طلائی زنجیروں میں لٹکتے ہوئے انار نما قندیلیں روشن تھے۔ باجرے رنگ کے پیر پھی دار ظروف میں لوبان سلگ رہا تھا اور طاقوں میں خوش رنگ پرندوں کے مجسمے سجے ہوئے تھے۔"

ابھی پاؤ رات ہی گزری تھی کہ خلوت گاہ میں لطف شباب گھل گیا تھا۔ تار اور مضراب میں رشتے قائم ہو گئے تھے۔ خواصیں نبید کی سربند بوتلیں قالسٹی طشتریوں میں رکھ کر لے آئیں۔ چھت کا ہفت رنگ حریری پنکھا ہولکے ساتھ ساتھ عطر بیزیاں کر رہا تھا۔ اور کھڑکی تلے، منزل زیریں میں، علاقہ کوہ قاف کی سرخ و سفید شوخ و تابندہ کنیزیں باری باری سے طنبور و رباب، جلاجل، قیثارہ اور دف و عود پر حسب و شباب اور شرب و گناہ کے شوق انگیز گیت گا رہی تھی۔

موسیقی کے ساتھ ساتھ وہ نبید پینے لگے۔ سب حجاب برطرف ہو گیا، تو لطیفہ طرازیاں شروع ہو گئیں پھر وہ بھی گانے لگے۔

اہویت بتقبل یدہا۔
فقالت قبل تشفتی

ترجمہ: میں نے کہا۔ کیا مجھے دست بوسی کی اجازت ہے؟"۔
اس نے جواب دیا۔ کوئی مضائقہ نہیں، آپ لب بوسی کر سکتے ہیں۔"

یہ زمانہ جاہلیت کی ایک شاعرہ کا بیت تھا۔

رات کے ڈھلتے ہی اندھیرا چل پڑا۔ خلوت گاہ کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دینے پڑے۔ اور مہمان نے میزبان کو بلا اکراہ و جبار مطیع اور فرمانبردار بنا لیا۔ یہ بات ملک عکاس کو حاصل نہ ہوئی تھی اتار نما قندیل یہ دیکھ کر بھڑکنے سے لگے تھے۔ پھر وہ جزوا و سالما پہاڑ سی رئیس زادہ کے تصرف میں آگئی تھی۔ وہ دونوں لبریز ہو رہے تھے۔ خلوت گاہ میں لطف و شباب کھل گیا تھا۔ طلاوہ مضراب میں رشتے قائم ہو گئے تھے۔

شہزادی کی آنکھوں میں پھر بابل کے جادو جاگ گئے اس کا چہرہ خمار سے طلا بن گیا۔ وہ امیر زادے کو "یا جلیسی، یا جلیسی" کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ اور کبھی کہہ رہی تھی: "اَحْسَنْتَ! اَحْسَنْتَ! اَحْسَنْتَ!"

رات کے آخری حصے میں اندھیرا بند ہو گیا۔ اور وہ ہنوز حسن و شباب کی شوخیوں میں گم تھے اور کوہ قاف کی پری نادکنیزیں کواڑوں کی جھریوں سے شرم اور بے باکیاں، حجاب اور عریانیاں، صلح اور لڑائیاں، شکست اور کامیابیاں دیکھ رہی تھیں۔ کسی کے ہونٹوں پر ہنسی بن رہی تھی تو کسی کے کپڑوں پہ۔

مگر کریں سبھی کی پلکے کھا رہی تھیں۔

اتنے میں پھاٹک کی طرف سے شور اٹھتا ہوا آیا۔

اہلاً و سہلاً مرحبا! اہلاً و سہلاً مرحبا، اہلاً و سہلاً مرحبا!"

ملک عکاس کوئی ساعت میں آیا چاہتا تھا۔ اور کچھ ہی ساعت میں۔۔۔

۔۔۔۔۔۔جب چودھویں کی چاندنی سفید فصیل، باغات اور محل کو اور بھی سفید بنا رہی تھی۔ جلا وطن گھر آ گیا۔ نوبت نقارے اور شہنائیاں بجنے لگیں۔ حبشی خدمت گار زرق برق وردیاں پہنے ہوئے ادھر ادھر دوڑتے پھرنے لگے۔

مگر پہاڑ سی رئیس زادہ تپیدہ کے ساتھ رکاب سے رکاب ملائے ہوئے

اڑتے ہوئے عربی گھوڑوں پر دیوار کے جنگلات سے پرے ہوئے پہاڑوں کی طرف چلا جا رہا تھا ۔ نعلِ ہائے ہلالی کی شرر انگیزیاں ریت میں سوئے ہوئے مرگِ چڑوں کو جگا جگا کر اڑا رہی تھیں، اور بلوریں قہقہے ریگستان میں حباب پیدا کر رہے تھے ۔

ملک عکاس کی آؤ آور کرنے والا کوئی نہ تھا ۔ اس کی خوشبا مین اختلاجِ قلب اور ہول کی وجہ سے بے ہوش پڑی تھی ۔ مگر علاقہ کوہ قاف کے گل گلزار شہر پاس سے اپنے آقا کو مٹکا ہوا لینز، ہیدکی سر بند اور کھلی بوتلیں اور نوبان کے پیڑھی دار ظروف دکھا رہے تھے ۔ ان کے کچھ بھی مجھ میں نہیں تھا ۔ ان کی چنگ مٹگ اور اطوار کہہ رہے تھے کہ قبیحہ گئی تو کیا ہوا ۔ مضی ما مضی! ہم تو موجود ہیں ۔ دنیا کی چادریں اور تکیے تک ابھی نہیں بدلے گئے ۔ ہم بھی جوان ہیں، تم بھی جوان ہو ۔ پھر کیا حرج ہے ۔ گھر خالی ہے کوئی مواخذہ خواہ نہیں ۔ ہم سے جوشِ سرور میں کوئی منہائی نہ پاؤ گے ۔ ہیں سنگ ذوق نہیں ۔ ہم بھی شہزادی کی طرح سب حربوں میں طاق ہیں ۔ ہمارا طرزِ کلام ملاحظہ فرمایا، کتنا فتنہ خیز ہے ۔ جو طاقت آزمائی کے بعد ناطقی آگئی ہو، تو اس کے رفع کرنے کے لئے یا الحمد ہمارا آتش خلبی موجود ہے ۔

اگلے دن قصرِ دباغات کا نقشہ ہی بدل گیا ۔ قبیحہ کی ماں تو مر گئی، بچا کچھا بھی شکار سے نہیں لوٹا اور ملک عکاس کو قتنہ بغداد کی بیماری لگ گئی تھی، اب وہ آسیب زدہ ہو گیا تھا ۔ اب وہ زور زور سے رو رہا تھا ۔ اب وہ چیخ رہا تھا اور کپڑے پھاڑ رہا تھا ۔ اب اسے کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی ۔ اب وہ محل سے اٹھ اٹھ کر فصیلِ باغات کی طرف دوڑ رہا تھا کہ پھاٹک سے نکل کر ریگستانوں میں چلا جائے اور حبشی پہرے دار دیکھتے ہی دیکھتے رہ جائیں۔

میری لائبریری کی تاریخ، ادب، ناول، افسانا اور دیگر علوم کی کتابیں

* تاریخ و سوانح

کتاب	قیمت
ابوبکر صدیق اکبر	۵٫۰۰
عمر، فاروق اعظم	۱۰٫۰۰
دس بڑے مسلمان	۴٫۰۰
خالد، سیف اللہ	۲٫۵۰
المامون	۲٫۵۰
الہارون	۲٫۲۵
ابوذر غفاری	۲٫۰۰
سلطان محمد فاتح	۱٫۵۰
الحسین	۱٫۵۰
رابعہ بصری	۱٫۵۰
امیر معاویہ	۱٫۲۵
عمر بن عبدالعزیز	۱٫۲۵
امام زین العابدین	۱٫۲۵
شیخ عبدالقادر جیلانی رح	۱٫۲۵
الزہرا	۱٫۰۰
تذکرہ	۳٫۷۵
قلوپطرہ	۳٫۷۵
روپ متی	۲٫۵۰
سلطانی محلوں کے راز	۳٫۷۵
ولیم فاکنر	۱٫۷۵
ارنسٹ ہیمنگوے	۱٫۷۵
39 بڑے آدمی	۳٫۷۵

* ادب

کتاب	قیمت
بہترین انشائی ادب	۵٫۵۰
ادب کا تنقیدی مطالعہ	۲٫۲۵
میرزا ادیب 'بہترین افسانے	۲٫۵۰
احمد ندیم 'بہترین افسانے	۳٫۷۵
زاد راہ	۲٫۲۵
فاصلے	۲٫۰۰
میرے بھی صنم خانے	۳٫۷۵
غبار خاطر	۳٫۷۵
تھر کا دیس	۳٫۷۵
سہرے کے پھول	۳٫۰۰
منزل منزل دل بھٹکے گا	۲٫۵۰
دل بھولتا نہیں	۱٫۵۰
دیوان غالب (فارسی)	۸٫۰۰
انتخاب غالب	۰٫۵۰
لذت آوارگی	۳٫۰۰
پنجابی ادب کی تاریخ	۳٫۰۰

کتاب	قیمت
دغاباز (ڈرامہ)	۱٫۲۵
تیسری عورت	۳٫۰۰
چاند روشن نہیں ہے	۳٫۰۰
63 کے منتخب افسانے	۲٫۵۰
64 کے منتخب افسانے	۳٫۰۰
متاع ادب	۲٫۲۵
دیوان آتش	۱٫۵۰
میدان عمل	۴٫۵۰
ننگی دھرتی	۵٫۰۰
اھٹیں	۱٫۷۵
کرن کرن اندھیرا	۴٫۵
افق سے افق تک	۳٫۷۵
ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ	۲٫۵۰
لفنگے کی ڈائری	۱٫۷۵
خوشبو کے گھاؤ	۴٫۵۰

* عمرانیات

کتاب	قیمت
لباس کا مسئلہ اور ٹیڈی ازم	۱٫۵۰

* طنز و مزاح

کتاب	قیمت
حماقتیں	۳٫۰۵
مزید حماقتیں	۳٫۷۰
پرواز	۱٫۷۵
لہریں	۱٫۷۵
راجا صاحب	۱٫۷۵
چراغ تلے	۱٫۵۰
گرما گرم (لطیفے)	۱٫۵۰
ڈھول کا پول (کارٹون)	۱٫۰۰
سنگ و خشت	۱٫۵۰
شیشہ و تیشہ	۱٫۵۰
گرد کارواں	۱٫۵۰
چنگ و رباب	۱٫۵۰
لرم لرم	۱٫۵۰
بال و پر	۱٫۵۰
نوک نشتر	۱٫۵۰
اندیشۂ شہر	۲٫۰۰

* شکار، علم، مذہب

کتاب	قیمت
حلال و حرام (مذہب)	۲٫۲۵
معلومات کا انسائیکلوپیڈیا	۳٫۷۵
شیر، شیر، شیر (شکار)	۳٫۰۰

مفصل فہرست طلب کریں

مصنف خان فضل الرحمان

بیسویں صدی کے آغاز میں بمقام رائپور ضلع سہارنپور (یو-پی) پیدا ہوئے۔ جہاں ہیڈ تاجیے والا سے آ کر نہر جمن شرق گزرتی تھی، شمال میں سال کے سرحیون جنگلات سے بنی ہوئی شوالک کی پہاڑیاں تھیں، پھر دون کا میدان اور اس کے بعد ہمالہ۔ نام حضرت شاہ عبد الرحیم رائپوری نے رکھا تھا اور انہیں کے اتارے ہوئے کپڑوں کو بہت عرصہ تک بعہد شیر خواری پہنتے رہے، مسلم ھائی سکول انبالہ، گورنمنٹ کالج لاہور اور لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔

۱۹۴۸ء میں ھجرت کر کے لاہور آئے اور اب یہیں وکالت کرتے ھیں، ۱۹۵۲ء میں حج کیا، صوم و صلواۃ کے پابند ھیں۔ مرغ بانی، حیوانات کی نسل کشی، اور شکار کا بہت شوق رہا ھے، بڑے پیمانے پر کاشت کرتے تھے، سیر کے شوقین ھیں اور بہت اچھے تیراک۔

نامورانِ اسلام میں ٹیپو سلطان، محمد علی جناح رح، علامہ اقبال رح سے خاص عقیدت ھے۔ **تصنیف:** آفت کا ٹکڑا (ناول) کئی ایک غیر مطبوعہ ناول و افسانے۔

ناشر: بشیر احمد چودھری، ناشرین کے اس خانوادے کے فرد ھیں، جس نے جدید ادب کی نشر و اشاعت میں نولکشوری خلوص اور جذبے سے کام لے کر برصغیر پاک و ھند کے بیش تر نئے مصنفین کے ادب پاروں کو قارئین کے نظر نواز کیا۔

۱۹۳۵ء سے آج تک مختلف حیثیتوں سے نشر و اشاعت کی گراں قدر ذمہ داریوں کو نباہ رہے ھیں، اس دوران میں اپنے خاندان کے مختلف اداروں سے وابستہ